سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی تہ عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، اتمامِ حکومتِ الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیتِ کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات وخصائصِ نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایاتِ صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآنِ پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان ستے، تقطیع خورد صہ و ستے، حصہ سوم تقطیع کلان سلے، وللعہ، تقطیع خورد سعہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلان سے، روسے، تقطیع خورد سعہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ، وللعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۲ | ماہ جمادی الاولٰی ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۸ء | عدد ۱

مضامین

لغات جدیدہ:- چار ہزار جدید عربی الفاظ کا لغت، طبع سوم، حجم ۱۶۱ صفحے قیمت عہ "منیجر"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ابتدائی تعلیم کی جو اسکیم وردھا اسکیم کے نام سے مشہور ہے اور جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ترتیب دیا ہے، اس پر غور کرنے کے لئے شملہ میں ایک مرکزی کمیٹی بیٹھی تھی، اس میں ڈاکٹر صاحب نے ان اعتراضوں کا جواب دیا، جو اس اسکیم پر کئے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ایک فقرہ یہ بھی کہا،

"اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کی گنجائش پوری رکھی گئی ہے، جس کا انتظام نہایت غور کے بعد طے کیا گیا ہے کہ اسکول کے اوقات کے علاوہ ہو، اور ہر فرقہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا انتظام کرے" (ملت دہلی)

ہم کو اس اسکیم کے بانیوں کی اس کشادہ دلی سے بڑی خوشی ہوئی، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اسکول کے اوقات کے علاوہ جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کی اہمیت تعلیم میں کیا رہ جاتی ہے؟ پھر یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس خارج از اوقات تعلیم کے مصارف کا بار کون اٹھائے گا، آخر اس دنیا میں دین کا یہ اچھوت پن کب تک قائم رہے گا،

مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت اور تیاری پر جو شذرہ معارف میں لکھا گیا تھا، اکثر صوبوں کے مسلمانوں نے اس کی سچائی کو تسلیم کیا، اس سلسلہ میں سی پی کے ایک دردمند مسلمان کے خط کا اقتباس دیا جاتا ہے،

"یہاں کی یونیورسٹی میں مسلمانوں کا پتہ نہیں، صوبہ بھر میں اردو کا ایک پروفیسر ہے، اور ایک ہائی اسکول، حالانکہ اس صوبہ میں آٹھ نو لاکھ مسلمان بستے ہیں، یونیورسٹی کی مہر میں ناگ دیوتا بطور نشان علم کے استعمال کیا گیا ہے، بی اے کے کورس میں اعثم کوفی کی تاریخ کا اردو ترجمہ جو کہ سیفی پریس دہلی سے شائع ہوا ہے، لازمی نصاب کے طور پر رکھا گیا ہے، ودیا مندر جبری تعلیم کی اسکیم ہے، مگر اس میں اردو کا کوئی انتظام نہیں، اب مسلمان یا تو ہندی اور مرہٹی پڑھیں گے یا جبری تعلیم کے قانون کی خلاف ورزی میں قابل تعزیر قرار دیئے جائیں گے؛"

اوپر اس دردمند نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں غور یہ کرنا ہے کہ اس میں کس کا کتنا قصور ہے، جب تک مسلمان اپنے عمل سے یہ ثابت نہ کردیں کہ ہندوستان اور ہندوستان کی چیزیں صرف ہندوؤں کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی بھی ہیں، جب تک ہم کو اپنے ہموطنوں کی چیرہ دستی کی شکایت نہیں کرنی چاہئے، مسلمانوں کو اس وقت جوش عمل، استحکام وقوت اور عزم صادق کی ضرورت ہے، مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں، بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی صحیح پوزیشن کو قائم کرنے کے لئے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے، ورنہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد قومیت کے پرخچے اڑ جائینگے،

یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، کہا جاتا ہے کہ سرکاری تعلیم اور سیاسی معاملات میں مذہب کو دخل نہیں آمنا وصدقنا، مگر پھر کیا ہے کہ سیاسی و تعلیمی شعاروں میں ہندو مذہبی تخیل کی الوہیت کا ترانہ گایا جاتا ہے، اور نشان بنائے جاتے ہیں، اب یا تو یہ کہدیا جائے کہ یہ سراسر ہندو مذہبی تخیل تم کو زبردستی قبول ہی کرنا پڑے گا، یا مشترکہ ومتحدہ ہندوستان اپنے لئے آپ اپنے ملکی شعار بنائیگا اور ملکی ترانے گائے گا،

اب تک دو ہی قسم کے مسلمان سمجھے جاتے ہیں، ایک وہ جو اپنے دین وملت سے ٹوٹ کر کانگریس میں مدغم ہوگئے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو مسلمانوں کے وہمی حقوق اور فرضی امتیازات کا خواب دیکھتے ہیں، لیکن بھولنا نہ چاہئے کہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جو اپنی دعاؤں میں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ

فی الآخرۃ حسنۃ، کہ کر دونوں کی بھلائیوں کا طلبگار رہے، ملکی آزادی کی پوری جد وجہد کے ساتھ اسکو اپنے دین وملت کے ساتھ بھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبت ہے، اور اسی کی خاطر وہ ہر کام کرتا ہے، اگر واقعی طلبگار آزادی مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں تو ان کو اٹھ کر اپنا خاکہ اسی طرح پیش کرنا چاہئے جس طرح کانگریسی وزارتیں کر رہی ہیں، اور جیسے یہ آزاد حکومتیں اپنی سیاسی تجویزوں کو عمل میں لا رہی ہیں، آزاد مذہبی مسلمان بھی اپنے خاکہ کو مسلمانوں کے لئے عمل میں لانے کی کوشش کریں، بلکہ کیا اچھا ہو کہ اسلامی صوبوں کی وزارتیں دار القضا اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں اور ان کو عمل میں لائیں، تاکہ اس باب میں غیر اسلامی صوبے بھی اُن کے نقش قدم پر چل سکیں،

انگریزی خواں علما کی ضرورت روز بروز جیسی بڑھ رہی ہے وہ تو معلوم ہے، لیکن مشکل یہ ہے، کہ علما انگریزی خواں ہونے کے بعد علما نہیں رہتے، ایک گریجوایٹ ڈاکٹر پی ایچ ڈی عالم و فاضل مشرقی کو جو بحمد اللہ پرانی عربی درسگاہ کے سند یافتہ بھی ہیں، ہیٹ اور انگریزی لباس پر ٹوکا تو جواب ارشاد ہوا کہ اس کے بغیر رعب نہیں بیٹھتا، پوچھنے کو جی چاہا کہ آپ کی فرنگیت کا یا آپ کی علمیت کا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ہماری ہی مرعوبیت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے عالم انگریزی پڑھ کر عالم نہیں رہتے، بلکہ اس نسبت کو اپنے لئے تحقیر اور اپنے حق میں توہین سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ یہ اعزاز، یہ تنخواہ اور یہ بلند کرسی اسی کے بدولت پا رہے ہیں،

بہرحال بات کہنی کچھ تھی، اور ہو کچھ گئی، ایک اسلامی ریاست کو تین ایسے انگریزی داں علما، کی ضرورت ہے جو تبلیغ و اصلاح کا کام کرسکیں، تنخواہ ستر روپیے ملے گی، اگر کچھ لوگ ایسے ہوں، جو دلی ولولہ کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکیں جنھوں نے یہ کام کیا ہو یا ان میں کرنے کی اہلیت ہو، وہ درخواستیں ہمارے پاس بھیج دیں،

مقالات

اسلامی نظام تعلیم

از مولینا سید ریاست علی ندوی

(۶)

حلقۂ درس

اساتذہ کا ورود حلقۂ درس میں

اسلامی عہد کے درس کے حلقوں (کلاسس) کا نظارہ ذیل کے بیان سے ہوگا جسے قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ وطلبہ کے آداب میں بیان کیا ہے، اساتذہ درس کے حلقہ میں جانے کے لئے اہتمام کرتے تھے، جیسے حلقہ میں صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر آتے تھے، امام مالک کا یہ معمول تھا کہ وہ جب حلقہ میں جانیکا تہیہ فرماتے تو پہلے غسل کرتے پھر اچھے کپڑے پہنتے خوشبو لگاتے، اس کے بعد درس کے حلقہ میں تشریف لیجاتے،

اساتذہ روانگی سے پہلے خیر و برکت حاصل کرنے اور ضلالت اور گمراہی سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دعاے ماثورہ پڑھتے تھے اللھم انی اعوذبک ان اضل او اضل او ازل او ازل او اظلم او اظلم او اجھل او یجھل علی (ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۳۰) پھر ذکر الٰہی کرتے ہوے درس کی مجلس میں آتے، اور مجلس کے حاضرین کو سلام کرتے، یہاں پہنچکر اگر کوئی مکروہ وقت نہ ہوتا، تو دو رکعتیں نماز پڑھتے اور نماز کے بعد خشوع وخضوع سے توفیق خداوندی حاصل کرنے اور لغزشوں سے بچنے کی دعا کرتے اس کے بعد قبلہ کی طرف منہ کرکے مجلس کیسامنے بیٹھ جاتے،

اساتذہ کا طریق نشست،

اساتذہ درس کے حلقہ میں جیسا کہ اوپر گذرا، کسی اونچے مقام کرسی یا منبر پر بیٹھتے تھے بعض لوگ جو مسجد کے صحن میں درس دیتے تھے، وہ کسی نیچی دیوار پر یا کسی مینار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے

تھے، اور بیٹھنے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرتے تھے، جو اہل علم کی نشست کے وقار کے خلاف ہو،

غیر سنجیدہ حرکتوں سے اجتناب

حلقہ میں غیر سنجیدہ حرکتوں سے باز رہتے تھے ہنسی مذاق یا مزاح نہ کرتے تھے[۱] سالم بن جنادہ، حضرت وکیع بن جراح متوفی ۱۹۷ھ کے متعلق کہتے ہیں:۔

"میں وکیع کی معیت میں سات سال تک بیٹھا، لیکن میں نے انھیں نہ کبھی تھوکتے دیکھا، نہ کسی کنکری سے کھیلتے ہوئے پایا، وہ جس نشست سے بیٹھتے، پھر پہلو نہ بدلتے تھے، وہ ہمیشہ قبلہ رو ہو کر بیٹھا کرتے تھے[۲]"

آغاز درس

درس کا آغاز کسی خوش الحان قاری کی تلاوت قرآن سے کیا جاتا تھا، اس کے بعد "مستملی" ونقیب اہل مجلس کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے، اس کے بعد سب سے پہلے شیوخ بسملہ پڑھکر صلوٰۃ اور سلام بھیجتے، پھر وہ اور تمام حاضرین دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے، اس کے بعد استعاذہ، بسملہ اور حمد و صلوٰۃ نئے سرے سے پڑھکر درس کی تقریر جاری کرتے تھے،[۳]

درس و افہام و تفہیم کا طریقہ

درس میں آواز نہ زیادہ بلند ہوتی، اور نہ زیادہ پست، بلکہ اتنی ہوتی کہ مجلس کے حاضرین اُسے آسانی سے سُن سکیں، اور آواز مجلس کے باہر نہ جانے پائے، مسائل کو ذہن نشین کرانے کے لئے عموماً جملوں کو تین مرتبہ دہراتے تھے، درس کے درمیان جہاں مسلسل بیان کی ضرورت ہوتی تقریر مسلسل جاری رکھتے، جہاں امتیاز پیدا کرنا ہوتا، تو ٹھہر جاتے، اور جب گفتگو منقطع کرنے کی ضرورت ہوتی، منقطع کر دیتے، اثنائے تقریر میں اگر اسلام کے خلاف کوئی شبہہ وارد ہوتا، تو اسے بیان کرتے، مگر یہ پابندی رکھتے، کہ اس کا جواب بھی اسی مجلس میں شبہہ پیش کرنے کے بعد ہی بیان کر دیں، اور اگر جواب دینے کا موقع نہ ہوتا تو شبہہ کی تفصیل اور دلیل بیان کرنے کے بجائے صرف اشارہ کرکے تقریر ختم کر دیتے، اور اسکی تفصیل اور جواب کو دوسرے دن کے لئے اٹھا رکھتے تھے،

۱ تذکرۃ السامع ص ۳۱،۳۲، ۲ تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۲۰۲، ۳ تذکرۃ السامع ص ۳۴،۳۵،

درس کی تقریر نہ اتنی طویل ہوتی، کہ غیر ضروری باتیں چھڑ جائیں، اور نہ اس قدر مختصر کہ طالبوں کی تشفی نہ ہو سکے[۱]، اساتذہ درس کے اثناء میں طالب علموں سے حسن تلطف سے پیش آتے تھے، مسائل کو ان کی سمجھ کے مطابق آسان کرکے بیان کرتے تھے، اور مسائل کی تمثیلات سے تشریح کرتے تھے[۲] اور لوگوں کے سوالوں کا جواب علیحدہ علیحدہ دیتے تھے، اگر استاذ کوئی مسئلہ کسی کو سمجھاتا، اور گفتگو کے درمیان کوئی دوسرا طالب علم کوئی شبہہ پیش کرتا، تو گفتگو چھوڑ کر شبہہ پیش کرنے والے کو تسلی دیتے، کہ پہلے وہ اس شخص کی گفتگو ختم کر لیں تو اس کے شبہہ کو دور کریں گے، ربیع کہتے ہیں کہ امام شافعی کا بھی یہی طرز عمل تھا[۳]، اور اگر کوئی شخص غیر ضروری رد و کد کرتا، تو اسے تنبیہ کیجاتی تھی[۴]، جو لڑکے کچھ کہنا چاہتے، اور مفہوم ادا نہ کر سکتے تو استاد ان کی مدد کرتا، اور خاص توجہ سے ان کا مافی الضمیر معلوم کرکے ان کی تشفی کرتا[۵]

آزمائشی سوالات اور اثنائے درس میں طلبہ کی استعداد کا امتحان

اساتذہ درس کے درمیان طالب علموں سے آزمائشی سوالات کرتے تھے، اگر جواب مشکل ہوتا تو طلبہ کو ایک ایک ہفتہ تک کی مہلت دیجاتی تھی، کہ اس درمیان میں تیار ہو کر اس سوال کو حل کریں[۶]

کبھی دوسرے طریقوں سے طالب علموں کی استعداد کا امتحان لیا جاتا تھا، ابن ابی حاتم یہ واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ وہ ایک جماعت کے ساتھ مشہور محدث محمد بن مصعب عرقسانی کے یہاں حدیث سننے کے لئے پہونچے، شیخ نے مکان سے برآمد ہو کر کہا ابھی ایک شعر زبان پر آگیا ہے، اگر تم میں سے کوئی بتادے، کہ یہ کس کا شعر ہے تو میں تین حدیثیں سناؤں گا، اس کے بعد شیخ نے وہ شعر پڑھا، ایک عراقی طالب علم نے آگے بڑھ کر اس شاعر کا نام بتایا، شیخ نے

۱ تذکرۃ السامع ص ۳۶ تا ۳۹، ۲ ″ ص ۵۱۔۵۲، ۳ ″ ص ۴۰، ۴ ″ ص ۴۱، ۵ ″ ص ۴۲، ۶ ″ ص ۵۳،

اسکی تصدیق کی، اور پوچھا اس کے بعد کونسا شعر ہے، طالب علم نے اس کے بعد کا دوسرا شعر سنایا، شیخ یہ سن کر خوش ہوئے، اور شعر و ادب میں امتحان لینے کے بعد حسب وعدہ ۶ حدیثیں انھیں سنائیں[1] نیز طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، اساتذہ ان میں سے بھی کبھی کوئی چیز کسی طالب علم سے امتحان کے طور پر پوچھ لیا کرتے، اور صحیح جوابوں پر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے،[2]

اگر کبھی طالب علم کے جواب سے خوشی ہوتی، اور اسکی کوئی ادا پسند آجاتی، تو اساتذہ طالبعلموں کو انعام بھی دیتے تھے، ابو عبید کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام محمد کے پاس امام شافعی اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاضر تھے، امام محمد نے ان سے کوئی سوال کیا، امام شافعی نے اسکا جواب دیا، اور جب امام محمد نے اس جواب کی تصدیق فرمائی، تو امام شافعی نے اسے لکھ لیا، امام محمد کو امام شافعی کا یہ شوق علم پسند آیا، اور خوش ہو کر سو درہم عطا کئے، اور فرمایا کہ تم پابندی سے آیا کرو، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے ایک اونٹ کے بوجھ کی مقدار میں لکھا ہے[3]

پردیسی طلبہ پر شفقت

اساتذہ اپنے درس کے حلقہ میں پردیسی طلبہ پر خاص شفقت کی نظر کرتے تھے، مجلس میں ان سے رعب دور کرنے اور ان کی دلدہی کے لئے ان سے مسلسل گفتگو کرتے اور رفتہ رفتہ وہ اجنبی طالب علم اپنے استاذ کی شفقت کے سایہ میں دوسرے ہم جماعت دوستوں سے گھل مل جاتے تھے، اور اساتذہ کو حلقہ کے ہر طالب علم کے نام النسب وطن اور ضروری حالات سے باخبر رہنے کی تلقین کیجاتی تھی،[4]

حلقۂ درس میں معاصر علما کی شرکت اور اساتذہ کا برتاؤ انکے ساتھ

جیسا کہ اوپر گذر چکا، درس کے حلقہ میں شاگردوں کے علاوہ استاد کے ہمعصر علما بھی کبھی شرکت کرتے تھے، اور انھیں حق حاصل تھا، کہ وہ استاد کی تقریر پر اپنے علم اور ادراک کے مطابق اعتراضات کریں، یا کسی مسئلہ میں استاذ کی رائے سے

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۵۸ [2] تذکرۃ السامع ص ۵۱، ۴۵ [3] مفتاح السعادۃ جلد ۲ ص ۱۰۹ [4] تذکرۃ السامع ص [5]

اتفاق نہ ہو تو دلائل سے اس کا رد کریں،

اساتذہ بڑی خوشی سے اپنے درس کے حلقہ میں ان معاصرین کا استقبال کرتے، اور ان کے شبہوں اور اعتراضوں کے جوابات دیتے تھے، جب استاذ کسی عالم یا فقیہ کو اپنے حلقہ میں آتے دیکھتا، تو اس کی آمد کے انتظار میں اپنی تقریر روک دیتا تھا، جب وہ آکر بیٹھ جاتا، تو اس مسلسل تقریر کے پچھلے حصہ کے ضروری جزوں کو نئے سرے سے اجمال کے ساتھ بیان کر کے پھر اپنی تقریر آگے جاری کرتا، اگر آنے والا کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب دیتا، اور اگر اس کا جواب اس کے علم میں نہ ہوتا، تو کج بحثی کرنے کے بجائے بلا تکلف اپنی لاعلمی ظاہر کرتا، اور آنے والا اس مسئلہ پر جو کچھ بیان کرنا چاہتا، بیان کرتا معلوں کا "لا ادری" (میں نہیں جانتا) "ولا اعلم" (مجھے معلوم نہیں) کہنا انکی کم علمی کے بجائے عالی ظرفی پر محمول کیا جاتا تھا،[1]

اگر ان مجلسوں میں ایک سے زیادہ اہل علم جمع ہوتے، تو ایک دوسرے کے علم کا احترام کرتے تھے، امام اوزاعی سے ابو محمد سعید بن عبد العزیز کی موجودگی میں اگر کوئی سوال کیا جاتا تھا تو فرماتے کہ "ابو محمد سے پوچھو"[2]

ترتیب حلقہ

استاذ کی بلند کرسی کے دائیں بائیں اگر ضرورت ہوتی، تو مستملی اور معید کھڑے رہتے سامنے کی نشست پر آگے ممتاز علما بیٹھتے، ان کے پیچھے اور دائیں بائیں شاگرد بیٹھتے تھے، ورنہ اگر موقع ہوتا، تو طالب علم عموماً ایک ہی رخ پر بیٹھتے تھے، تاکہ استاذ کی توجہ ایک سمت پر مبذول رہے،[3]

قرأت کی باری

جب حلقہ میں کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، تو قرأت کی باری اس طالب علم کی ہوتی تھی، جو درجہ میں پہلے آتا تھا، خواہ آنے والا اس مدرسہ کا طالبعلم بھی نہ ہو، اگر دو طالب علم

[1] تذکرۃ السامع ص ۲۴ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۰۳ [3] تذکرۃ السامع ص ۳۱، ۱۵۰، ۱۵۱،

ساتھ آتے تو ان میں قرعہ ڈال کر فیصلہ کیا جاتا تھا، پہلے آنے والے کا یہ حق اخلاقی طور پر تسلیم کیا جاتا تھا، اگر وہ کسی ضرورت سے حلقہ سے اٹھ جانے پر مجبور ہوتا، تو اس کا حق زائل نہ ہوتا تھا، وہ واپس آکر پھر اپنی قرأت جاری کرتا تھا،

البتہ اگر کوئی خاص وقت حلقہ کے مستقل طلبہ کے لئے مقرر کر دیا جاتا تو اس میں اجنبیوں کو یہ اجازت حاصل نہ ہوتی تھی،[1]

آدابِ درس طالب علموں کے لئے درس کے حلقہ میں شریک ہونے کیلئے چند لوازم تھے، جن کی پابندی کرائی جاتی تھی، جیسے حلقہ میں استاذ سے پہلے حاضر ہو جائیں، کیونکہ شاگردوں کو استادوں کے آنے کا انتظار کرنا چاہئے، نہ کہ استادوں کو لڑکوں کے آنے کا منتظر بنایا جائے،

حلقہ میں اچھے، صاف ستھرے اور سنجیدہ لباس پہن کر آئیں، شیخ ابو عمرو بن صلاح اس طالب علم کو حلقہ میں بیٹھنے سے روک دیتے تھے، جو عمامہ کے بغیر ٹوپی پہن کر آتا تھا،

طالب علم اپنی کتابیں حلقہ میں کسی اونچی چیز جیسے رحل پر رکھیں ورنہ ہاتھوں میں لئے رہیں،

کسی طالب علم سے اگر کوئی خلافِ ادب بات سرزد ہوتی، تو سوائے استاد کے کسی دوسرے کو ٹوکنے کی اجازت نہ تھی،

پھر حلقۂ درس میں وہ تمام آداب برتے جاتے تھے، جو معاشرتی مجلسوں میں ملحوظ رکھے جاتے تھے، مثلاً جب حلقہ میں پہونچتے، تو بلند آواز سے حاضرین کو سلام کرتے، حاضرین ایک دوسرے سے احترام سے پیش آتے تھے، ایک دوسرے کی تعظیم کرنے میں سبقت کرتے تھے، کسی کے آگے یا دو آدمی کے بیچ میں بیٹھنے سے احتراز کرتے تھے، جب کوئی حلقہ میں آتا، تو خندہ جبینی سے اس کا استقبال کرتے، کسی دوسرے کی قرأت کے درمیان اُسے ٹوکتے نہ تھے، اگر درس کے اثناء میں کسی سے گفتگو کرنی ہوتی تو

[1] تذکرۃ السامع ص ۹۰

استاذ سے اجازت لیتے تھے، کسی طالب علم سے کوئی بات ادب کے خلاف سرزد ہوتی، تو صرف استاد اور مرتب اسے ٹوکتے، طالب علم ایک دوسرے کو ادب نہ سکھاتے، جو لوگ مجلس میں دیر سے پہونچتے، وہ آخر میں بیٹھ رہتے، اگر کوئی اٹھ کر جاتا تو اس کی جگہ پر قبضہ نہ کرتے، اسے خالی چھوڑ دیتے، سن رسیدہ اور افضل طالب علموں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے، اور انھیں موقع دیتے، کہ وہ استادوں کے قریب بیٹھیں، تاکہ ان کے سوال و جواب سے دوسروں کو فائدہ پہونچے، بلکہ ایسے شاگردوں کو استاذ خود آگے بلا لیتے تھے، مثلاً امام احمد بن حنبل، شیخ ابو عاصم ضحاک بن مخلد کے درس کے حلقہ میں شریک ہوتے تھے، ایک مرتبہ وہ حلقہ میں دیر سے آئے تو جگہ پُر ہو چکی تھی، شیخ نے انھیں دیکھ کر آگے بلایا، لیکن انھوں نے لوگوں کی گردنیں پھاند کر جانے میں تامل کیا، تو شیخ نے حلقہ میں وسعت پیدا کرا کر ان کے لئے راستہ بنوایا، اور وہ اس سے ہو کر شیخ کے قریب جا کر بیٹھے، درس کے شروع اور خاتمہ دونوں پر حمد و صلوٰۃ کے علاوہ شیخ اور کتاب کے مصنف کے لئے دعاے خیر کرتے تھے، اور شیخ درس کے خاتمہ پر چند پر نصائح کلمے طالب علموں سے کہتا تھا،[1]

خاتمۂ درس قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں کو درس کے خاتمہ پر یہ دعاے ماثورہ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ فَاغْفِرْ لِيْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ پڑھنے کی ہدایت کی ہے، اور بعض اساتذہ اپنے درس کا خاتمہ زہد و اخلاق کے چند پند و نصائح پر کرتے تھے، قاضی ابن جماعہ نے اساتذہ کو مشورہ دیا ہے، کہ وہ درس ختم کر کے تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تاکہ طلبہ تہذیب اور شائستگی سے ان کے سامنے حلقہ سے نکلیں، اور باہر نکلنے میں باہم کشمکش نہ ہو، اس کے علاوہ جو لوگ پیدل جانے والے ہوں وہ چلے جائیں، تاکہ یہ بدنمائی نہ ہو کہ استاد سواری پر واپس جائے اور نادار طلبہ اور اس کے ہمعصر علما پیدل روانہ ہوں، اور جب حلقۂ درس خالی ہو جائے، تو استاذ اپنی

[1] تذکرۃ السامع ص ۲۹ و ۹۳ و ۹۶، و ۱۰۰ وغیرہ،

جگہ سے اوٹھے اور یہ دعا پڑھ کر روانہ ہو جائے،

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ [۱]

(۷)

طریقہ تعلیم و نصاب درس

اسلامی مدرسوں اور درس کے حلقوں میں بڑے طلبہ کو نہ صرف علوم کے انتخاب کا اختیار حاصل تھا، بلکہ انھیں اپنے استادوں کے انتخاب کی بھی آزادی حاصل تھی، وہ جس استاذ کو پسند کرتے اس کے درس کے حلقہ میں شریک ہو کر تعلیم جاری رکھتے تھے،

اساتذہ کا انتخاب اساتذہ کے انتخاب میں انھیں چند امور کا مشورہ دیا جاتا تھا، مثلاً ان کا فرض تھا کہ وہ خود وقت نظر سے مختلف استادوں کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لئے کسی کو منتخب کریں، اس انتخاب میں اہل علم دوستوں اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کریں، اساتذہ کی علمی استعداد کے علاوہ ان کے زہد، تقویٰ، اور اخلاق پر بھی نظر ڈالی جاتی تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ کن کن مشائخ کے حلقۂ درس سے فیضیاب ہوئے ہیں، اس لئے اساتذہ کے ذاتی کمالات کے علاوہ ان کے شیوخ کی منزلت سے بھی ان کی منزلت ہوتی تھی،

استاذ کے انتخاب کے بعد کم سے کم دو مہینے اس کے درس میں شریک ہونا ضروری قرار دیا گیا تھا تاکہ اس اثنا میں اپنی تشفی کے متعلق صحیح اندازہ ہو سکے، اگر طبیعت کو سیری نہ ہوتی، تو پھر اس حلقہ کو چھوڑ دیتے، لیکن دو ماہ سے پہلے چھوڑنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ اس سے کم مدت میں کسی استاذ کے متعلق صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے [۲]،

نو عمر طالب علموں کے لئے ان کے والدین اس فرض کو انجام دیتے تھے، اور اس مسئلہ میں

اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے مشورہ کرتے تھے، احمد بن سلمہ جو امام مسلم کے ساتھیوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انھیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کے لئے اپنے بعض دوستوں کو صلاح و مشورہ کی خاطر کھانے پر مدعو کیا، کھانے کے بعد اس مسئلہ پر مشورہ کیا اور اسکے بعد انھیں قتیبہ کے درس کے حلقہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا [۱]،

تعلیم کے ماہرین نے اساتذہ کے انتخاب کے مسئلہ میں اس کی ممانعت کی ہے، کہ صرف کسی استاذ کی غیر معمولی شہرت سن کر اس کی طرف رجوع کیا جائے، اکثر غیر معروف معلمین اور اساتذہ بڑی جانفشانی سے درس دیتے ہیں، اور ان کے حلقہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا امکان ہوتا ہے [۲]،

تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے بچوں کی تعلیم قرآن مجید کے درس سے شروع کراتے تھے، پہلے بچپن میں اسے پڑھا کر زبانی یاد کراتے، پھر قرآنی علوم طلبہ کے ذہن نشین کراتے تھے، اسکے بعد دوسرے فنون کی تعلیم دیتے تھے، قاضی ابن الجماعہ لکھتے ہیں:۔

"تعلیم کی ابتدا، اللہ تعالیٰ کی کتاب عزیز سے کرنا چاہئے، پہلے اُسے حفظ کیا جائے، پھر اسکی تفسیر اور دوسرے متعلق علوم میں مہارت پیدا کیجائے کیونکہ علم قرآن ہی تمام علوم کی بنیاد ہے، اور اُسے تمام علوم پر فضیلت و اہمیت حاصل ہے [۳]"،

ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ جو مختلف علوم میں بحر زخار تھے، فرماتے ہیں:۔

"مجھے میرے والد نے اس وقت تک حدیث پڑھنے کی اجازت نہیں دی، جب تک میں نے قرآن مجید کو فضل بن شاذان سے ختم نہ کر لیا [۴]"

ابن خلکان کا بیان ہے کہ

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۱،
[۲] تذکرۃ السامع ص ۸۵-۸۶، وتعلیم المتعلم ص ۱۰ تا ۲۲، [۳] تذکرۃ السامع ص ۱۱۲، ۲۱۳،
[۴] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۸۲۸،

"رئیس ابو علی ابن سینا دس سال کی عمر میں علم قرآن کا ماہر ہو چکا تھا"[1]

ہندوستان کے علماء کے سوانح میں بھی اس کی تصریح ملتی ہے، کہ یہاں بھی پہلے قرآن مجید پڑھاتے، اس کے بعد دوسرے علوم شروع کراتے تھے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی اپنے متعلق لکھتے ہیں:-

"اول از قرآن مجید بسابقہ تعلیم فرمودند سبق در سبق ایشان می نوشتند، و من میخوانم"[2]

ابتداءً بچوں کی تعلیم قرآن مجید سے شروع اور اسے ختم کرائے بغیر کسی دوسرے علم کے شروع نہ کرنے کا رواج تھا، مگر آگے چل کر اس طرز عمل میں کسی قدر تبدیلی پیدا ہوئی، تعلیم کی ابتدا تو قرآن مجید ہی سے کراتے، لیکن بعض ملکوں میں اس کے ساتھ دوسرے علوم بھی شروع کرا دیتے تھے، ابن خلدون نے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کو بیان کیا ہے، جسے مولینا عبد السلام صاحب ندوی نے اپنے مقدمہ التربیۃ الاستقلالیہ میں نقل کیا ہے، اسکا اقتباس ذیل میں پیش ہے، اس سے مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم کا فرق ظاہر ہو گا، لکھتا ہے:-

"اہل مغرب بچوں کو ابتدا میں صرف قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے، اور اس کے ساتھ کسی دوسرے علم مثلاً حدیث، فقہ، اور شعر وغیرہ کو نہیں ملاتے تھے، بربر بھی انہی کے مقلد تھے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اور لوگوں سے زیادہ قرآن مجید کے حافظ ہوتے ہیں"

اہل اندلس کا طریقہ یہ تھا، کہ قرآن پاک کیساتھ شعر، انشا پردازی، قواعد عربیت اور تجوید خط کی بھی تعلیم دیتے تھے، اور تجوید خط کا سب سے زیادہ لحاظ رکھتے تھے،

اہل افریقہ بھی اگرچہ قرآن پاک کی تعلیم کے ساتھ حدیث اور بعض دوسرے علوم کی تعلیم ملا دیتے تھے، لیکن قرآن مجید اور اس کے وجوہ قرأت کے ساتھ ان کو سب سے زیادہ اعتنا

[1] وفیات الاعیان جلد ا ص ۱۹۱ [2] اخبار الاخیار ص ۲۹۱،

تھا، اور تجوید خط ایک ضمنی چیز تھی، انھوں نے یہ طریقۂ تعلیم اہل اندلس سے سیکھا تھا، اس لئے یہ اہل اندلس کے طریقۂ تعلیم سے زیادہ مشابہ تھے،

اہل مشرق بھی قرآن مجید کے ساتھ اور علوم کی تعلیم دیتے تھے، لیکن تجوید خط کے ساتھ ان کو خاص اعتنا نہ تھا، اس کے الگ قواعد مقرر تھے، الگ معلم ہوتے تھے، مستقل طور پر اور صنعتوں کی طرح اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، اور مکاتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسکی تکمیل کیجاتی تھی،

طریقۂ تعلیم کے اس اختلاف کے نتائج بھی مختلف ہوتے تھے، مثلاً اہل مغرب اور اہل افریقہ نے چونکہ اپنی تمام تر توجہ قرآن پاک کی طرف مبذول کر دی تھی، اس لئے ان میں کسی علم کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا، کیونکہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے، کہ اس کے بیان کے اسلوب کا تتبع انسانی قدرت سے باہر ہے، اس لئے ان میں اس تعلیم سے عربیت کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا تھا،

البتہ اہل افریقہ نے چونکہ اس کے ساتھ اور علوم بھی ملائے تھے، اس لئے ان میں انشا پردازی کا ملکہ کسی قدر پیدا ہو جاتا تھا،

لیکن اہل اندلس نے چونکہ تعلیم قرآن کے ساتھ شعر، انشا پردازی اور عربیت کی تعلیم کو بھی ملا لیا تھا، اس لئے ان میں ادب اور لٹریچر کا نہایت عمدہ ملکہ پیدا ہو جاتا تھا"[1]

ہندوستان میں بھی پہلے قرآن مجید پڑھاتے، پھر لکھنا سکھاتے، اس کے بعد ہر فن کی مختصر کتابیں مثل کافیہ، لب الالباب، ارشاد وغیرہ پڑھاتے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے

[1] مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیۃ بحوالۂ مقدمۂ ابن خلدون ص ۶۱۶-۶۱۷، ابن خلدون کی بعض عبارتوں کے ترجمے بھی مقدمہ التربیۃ الاستقلالیہ سے منقول ہیں،

اپنے تحصیل علم کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اول از قرآن مجید متسابقہ تعلیم فرمودند بسبق درسبق ایشان می نوشتند، ومن می خواندم از قرآن مبین مقدار تعلیم کردہ ام، بعدازان باثر تربیت وشفقت ایشان چنان قوت بہم رسید کہ ہر روز قدرے از قرآن می خواندم، وہر مقدار کہ می خواندم پیش ایشان می گذرانیدم دردوسہ ماہ ختم قرآن تمام کردم۔

"و درخط وسواد چنانچہ معلمان صبیانی اطفال را در مکتبہا یاد دہند مفید نہ شدند، فقیر را تا فاد قاف برطریقہ اطفال مفید شدہ نویسانیدہ باشند، بعدازاں بطریق اجمال دراندک مدت شاید اگر مقدار یک ماہ تعیین کنیم، دروغ نگفتہ باشم، قدرت کتابت وسلیقہ انشا پیدا شد"

پھر ابتدائی تعلیم کی تفصیل بیان کرکے لکھتے ہیں:۔

می فرمودند تو یک مختصر از ہر علم بخوان ترا پسندیدہ است بعدازان انشاء اللہ چنان ابواب برکت وسعادت بر تو کشاید، کہ جمیع علوم بے تکلف تحصیل روے نماید"[1]

ہر فن کی اہم کتابوں کو زبانی یاد کرنا

قرآن مجید کی تعلیم کے بعد دوسرے علوم شروع کرائے جاتے تھے، اور سب سے پہلے اہم علوم حدیث، اصول، صرف ونحو کے اہم مسائل اور مبادیات طلبہ کو حفظ کرادیئے جاتے تھے، اور اس کے ساتھ علم قرآن میں بصیرت پیدا کرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا[2]

معیاری کتابوں کے حفظ کیلئے سلاطین اسلام کے انعامات

علوم کے مبادی کے حفظ کرنے کا طریقہ بڑی پابندی سے رائج تھا اور طالب علم کی تعلیمی بنیاد کی استواری کے لئے یہ بیحد ضروری سمجھا جاتا تھا، اسی وجہ سے سلاطین اور امراء نے طلبہ کی ہمت بڑھانے اور شوق دلانے کے لئے مختلف معیاری کتابوں کے

[1] اخبار الاخیار ص ۲۹۱،۲۹۰ [2] تذکرۃ السامع ص ۱۱۳

برزبان کرنے کے لئے مستقل گرانقدر انعامات مقرر کردیئے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ ان کتابوں کے برزبان کرنے میں سبقت کرتے تھے، چنانچہ مصر کے بعض سلاطین نے امام محمد کی مشہور تصنیفات پر جو فقہ حنفی کی بنیادی کتابیں ہیں گرانقدر انعامات مقرر کئے تھے[1]

حفظ کا طریقہ

اساتذہ، طالب علموں کو حفظ کرنے کے طریقے بتاتے تھے، زرنوجی طلبہ کو ہدایت کرتا ہے، کہ

"طالب علم کو چاہیئے کہ وہ دل میں سبق کے باربار دہرانے کا شمار کرتا جائے، آج کا سبق برزبان کرلینے کے بعد کل کے سبق کو پانچ مرتبہ، پرسوں کے سبق کو چار مرتبہ، اترسوں کا تین مرتبہ، اس سے پہلے کا دو اور اس سے بھی پہلے کا ایک مرتبہ پابندی سے دہرائے یہ طریقہ برزبان رکھنے کا سب سے بہتر ہے"[2]

حفظ اخبار وسیر

طلبہ کو جو چیزیں حفظ کرائی جاتی تھیں، ان میں صحابہ، تابعین، خلفاء، ائمہ اسلام، صالحین اور مشہور فقہاء کے نام اور ان کے مختصر حالات وسوانح بھی تھے، یہ انھیں املا کرا کر یاد کرائے جاتے تھے، تاکہ وہ علم اور مذہب کے ستونوں سے باخبر رہیں، لیکن ان اکابر کی ایک دوسرے پر باہمی فضیلت وغیرہ اختلافی مسئلوں پر مدرسہ میں بحث اور مناظرہ کی اجازت نہ تھی[3]

حفظ کتب

چنانچہ اسلامی مدرسوں کے طالب علم مختلف علوم وفنون کی چیزیں بہ کثرت حفظ کرتے تھے ابن خلکان ابوعلی بن سینا کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس نے اصول دین، ہندوستانی حساب اور جبر ومقابلہ کی چند چیزیں حفظ کیں"[4]

علامہ ذہبی فقیہ یونینی کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں پہلے قرآن یاد کیا، پھر لکھنا سیکھا، پھر حمیدی کی الجمع بین الصحیحین یاد کی، پھر چار مہینے میں صحیح مسلم برزبان کی اور ان

[1] الدرر الکامنہ ابن حجر [2] تعلیم المتعلم ص ۴۸ [3] تذکرۃ السامع ص ۵۰ [4] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۱۹۱

کے جلد یاد کر لینے کی مثال یہ ہے، کہ انھوں نے سورۂ انعام صرف ایک دن میں یاد کیا، اور حریری
کے تین مقامات ایک دن کے صرف بعض حصوں میں[۱] امام بخاری نے ۱۱ سال کی عمر میں علم حدیث کی تحصیل
شروع کی، اور ابن مبارک کی کتابیں بچپن ہی میں یاد کر لیں[۲]۔

ابوبکر بن انباری نحوی کے متعلق ان کے شاگرد ابو علی قالی کا بیان ہے، کہ کہا جاتا ہے، کہ انھیں
تین لاکھ اشعار صرف ایسے یاد تھے، جو قرآن مجید کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے تھے[۳]۔

سیوطی ابن قتیبہ کے صاحبزادے ابو جعفر احمد قاضی مصر متوفی ۳۲۲ھ کے متعلق لکھتا ہے، کہ

"یہ علم اور حفظ والوں میں سے تھے، انھوں نے مصر میں اپنے والد کی تمام کتابیں اپنے حفظ
سے تلامذہ کو پڑھ کر سنائیں، ان کے ساتھ کوئی کتاب نہ تھی، اور ابن قتیبہ کی کتابیں تعداد
میں اکیس تھیں[۴]۔"

ہندوستان کے اہل علم میں حفظ کا رواج،

ہندوستان کے اہل علم میں بھی کتابیں حفظ کر لینے کا رواج تھا، شیخ عثمان
ابن داؤد ملتانی متوفی ۷۳۶ھ کے متعلق سیر الاولیاء کے حوالہ سے نزہۃ
الخواطر میں ہے،

"انھیں فقہ میں ہدایہ اصول میں بزدوی، اور قوت القلوب مکی اور احیاء العلوم غزالی سلوک
وتصوف میں برزبان یاد تھیں[۵]۔"

بابا داؤد کشمیری متوفی ۱۰۹۷ھ کو مشکوٰۃ برزبان یاد تھی، اسی نسبت سے مشکوٰتی مشہور ہوئے
تذکرۂ علمائے ہند میں ہے:۔

"حافظ مشکوٰۃ المصابیح بود، بدین وجہ او را مشکوٰتی می گفتند[۶]۔"

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۱۲۴ [۲] ر جلد ۲ ص ۱۳۴ [۳] ر جلد ۳ ص ۵۰ [۴] حسن المحاضرہ جلد ا ص ۱۵۶
[۵] نزہۃ الخواطر ص ۷۶ [۶] تذکرہ علمائے ہند ص ۶۰

محدثین کا حفظ حدیث

علم حدیث کے طالب علم غیر معمولی طور پر حدیثیں برزبان کرتے تھے، امام احمد بن
حنبل فرماتے ہیں کہ

"میں نے ہر وہ چیز برزبان کر لی، جو ہشیم سے ان کی زندگی میں سنی تھی[۱]۔"

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں، کہ ایک مرتبہ میں مکہ جا رہا تھا، اثنائے راہ
میں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان کی روایتیں ایک دوسری سند سے میں نے حاصل کی تھیں، جو
دو جزوں میں لکھی ہوئی تھیں، میں نے خیال کیا کہ یہ دونوں جزء ساتھ موجود ہیں، انھیں شیخ سے
پڑھ لوں، چنانچہ میں نے ان سے استدعا کی، اور وہ سنانے پر آمادہ ہو گئے، اب میں اپنے جزء نکالتا
ہوں، تو سادے صفحات تھے، میں انہی کو ہاتھ میں لیکر سننے لگا، اور شیخ اپنی حدیثیں سناتے
گئے، اتفاق سے ان کی نظر سادے صفحوں پر پڑ گئی، اور انھوں نے برہمی سے کہا تمھیں شرم نہیں آتی میں
نے کہا، ابھی جو حدیثیں آپ نے روایت کیں، وہ مجھے یاد ہو گئیں، انھیں یقین نہیں آیا، اور خیال ہوا
کہ وہ پہلے سے یاد ہوں گی، میں نے کہا دوسری روایتیں سنائیے، میں سناؤنگا، چنانچہ
انھوں نے چالیس روایتیں سنائیں، اور ان کے سوال پر میں نے سب انھیں اسی وقت دہرا دیں
کہیں ایک حرف کی بھی غلطی نہیں ہوئی[۲]۔"

داؤد بن یحیٰ حافظ ابو عبداللہ محمد بن علی قرطمہ کے متعلق کہتے ہیں:۔

"لوگ حفظ میں ابو زرعہ اور ابو حاتم کا نام لیتے ہیں، واللہ میں نے قرطمہ سے زیادہ کسی کو
حافظ نہیں پایا، میں ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا، انھوں نے کہا یہ کتابیں رکھی ہیں، ان میں
سے کوئی اٹھا لو، اور میں پوری زبانی پڑھ دوں، میں نے کتاب الاشربہ اٹھائی، اور انھوں نے
اول سے آخر تک اُسے سنا ڈالا[۳]۔"

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ا، [۲] ر جلد ۲ ص ۲۰۹ [۳] ر ص ۳۰۹

امام شعبی فرماتے ہیں کہ "مجھ سے جب کسی شخص نے حدیث بیان کی، تو اس کو میں نے حفظ کر لیا، میں جو کچھ سنتا ہوں اُسے حفظ کر لیتا ہوں[۱]"۔

امام عجلی سے پوچھا گیا کہ کیا ان کے پاس حدیثوں کے مجموعہ کی کوئی کتاب موجود ہے؟ تو انھوں نے فرمایا، "میرا سفینہ میرا سینہ ہی ہے" وہ بصرہ میں اپنے وقت کے حدیث کے سب سے بڑے حافظ تھے[۲]

اسباق میں طلبہ کی ذہنی استعداد کا لحاظ

مبتدیوں کو اتنا سبق دیا جاتا جتنا وہ یاد کر سکتے تھے، زرنوجی اپنے مشائخ کا یہ قول نقل کرتا ہے، کہ "مبتدیوں کو بس اسقدر سبق دینا چاہئے، جسے وہ دو مرتبہ کے اعادہ سے یاد کر لیں[۳]"۔

اس کے بعد جیسے جیسے طالب علم کی استعداد بڑھتی اسباق تدریجی طور پر بڑھاتے جاتے تھے کسی طالب علم کو اس وقت تک کوئی چیز لکھنے کی اجازت نہ تھی، جب تک وہ اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لے جب نئے طلبہ حلقہ میں آتے، تو شیخ ان کی ذہنی استعداد کا امتحان لیتا، ماہرین تعلیم نے اسکی ہدایت کی ہے[۴]

علوم کی تعلیم میں یہ بھی ضروری سمجھا جاتا تھا کہ ایک فن میں مہارت حاصل کرنے کے بعد دوسرے کو شروع کیا جائے، امام غزالی اور ابن خلدون نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے[۵]،

طرز تعلیم

علامہ شبلی علیہ الرحمہ اسلامی نظام تعلیم کے دور اول میں طرز تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا، جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے، یعنی املا جس کو اردو میں لکچر دینا کہتے ہیں، استاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا، اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا طالب علم جو ہمیشہ دوات و قلم لیکر بیٹھتے تھے، ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے، اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار

۱؎ طبقات الشافعیہ سبکی جلد ۱ ص ۲۴۴ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۱۳ ۳؎ تعلیم المتعلم ص ۴۸ ۴؎ تذکرۃ السامع ص ۵۲ تذکرۃ السامع
۵؎ احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۴

ہو جاتی تھی، اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی، امالی ابن درید اور ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں، جب معمول سے زیادہ طلبہ حلقۂ درس میں جمع ہوتے تھے تو استاد کے سامنے دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے، جو دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے، یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے، یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، ابو بشر متی جو بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا، اس کے لکچر میں سینکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے، جن میں فارابی بھی تھا، اور اس نے کئی سو صفحے خود نقل کئے تھے[۱]"

طلبہ املا و سماع کے وقت پورے طور پر متوجہ رہتے تھے، یہانتک کہ اگر وہ کسی مشغلہ میں لگ جاتے تو بھی توجہ ادھر سے نہ ہٹتی، امام دارقطنی کی طالب علمی کے زمانہ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ وہ اپنی کم سنی کے زمانہ میں اسمٰعیل صفار کی مجلس میں حاضر تھے، صفار حدیثیں سناتے جاتے، اور سماع میں شریک ہونے کے باوجود کوئی دوسری چیز لکھتے جاتے تھے، یہ دیکھ کر ایک ساتھی نے جھنجلا کر کہا تم لکھنے میں مصروف ہو تمہارا سماع جائز نہ ہوگا، دارقطنی کو بھی طیش آیا اور انھوں نے کہا کہ املا کیلئے میری سمجھ تمہاری سمجھ سے مختلف ہے، کیا تمھیں یاد ہے کہ شیخ نے کس قدر املا کرایا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا، تو دارقطنی نے تفصیل بیان کرنی شروع کی کہ اٹھارہ حدیثیں لکھا چکے ہیں، پہلی حدیث عن فلاں عن فلاں تھی، اور اس کا متن یہ اور یہ تھا، دوسری حدیث عن فلان عن فلان ہے، اور اس کا متن یہ اور یہ ہے، اسی طریقہ سے اس وقت کی لکھائی ہوئی کل حدیثیں زبانی سنا دیں، یہ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی[۲]،

جب درس کے حلقہ میں مقرر کتابیں پڑھانے کا دستور ہوا، تو اس کے دو طریقے رائج تھے، بعض مرتبہ اساتذہ کتابوں کی قرات کرتے تھے، اور شاگرد انہیں سنتے تھے، اور بعض حلقوں میں

۱؎ تذکرۃ السامع ص ۵۶ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۰۰،

استاذ کے سامنے کتابون کی قرأت شاگرد کرتے تھے، اور استاذ انھیں سنتا، اور حسب ضرورت غلطی
کے موقعوں پران کی تصحیح کرتا، اور مشکل مقاموں پر شبہے دور کرتا،

سندین ان مختلف طریقوں سے حاصل کئے ہوئے علم کی سندوں میں اعتبار اور استناد کے لحاظ سے
درجے اور امتیاز قائم تھے، اور اسی لحاظ سے سندین دیجاتی تھیں، اور ان سندون کی مختلف قسمیں تھین
مثلاً ایک قسم کی سند اصطلاحاً "اجازۃ" کہلاتی تھی، یعنی شیوخ اپنے کسی شاگرد کو کسی کتاب کا کچھ حصہ پڑھا
دیتے، اور اس کے باقی حصّوں کے پڑھنے کی اجازت اپنے کسی ایسے شاگرد کو دیتے، جسے وہ
پہلے پڑھاکر سند دے چکے ہوتے، یا اس طالب علم کو خود بغیر کچھ پڑھائے ہوئے اپنے شاگردون
کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیکر اپنے کسی شاگرد سے اپنی کتاب کے پڑھنے کی
اجازت دیدیتے تھے، اب وہ طالب علم پہلے فارغ التحصیل شاگرد سے اس کتاب کی "اجازت" کے
طریق پر سند قرأت لیتا، جیسے امام شافعی کے سامنے ان کے ایک شاگرد زعفرانی نے کتاب الام بجز
کتاب الصلوٰۃ والمناسک کے پوری پڑھی، اور کتاب الصلوٰۃ اور کتاب المناسک خود امام شافعی
نے ان کے سامنے پڑھ دین، اس کے بعد امام شافعی بغداد پہونچے، یہان ایک دوسرے اہل علم کرابیسی
ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے کتاب الام کی کتابیں (ابواب) پڑھنی چاہئیں، لیکن امام
شافعی نے ان سے فرمایا، کہ میں زعفرانی کو کتابین دیچکا ہون، ان سے حاصل کرلو، میں تمھین ان سے پڑھنے
کی سند اجازہ دیتا ہون۔[1]

طریق سماع واجازہ وقرأت کے فرقوں کا اندازہ حافظ ابن المفضل کے ذیل کے بیان سے
ہوگا، وہ فرماتے ہیں،

"میں نے سلفی سے پوری معجم بطریق اجازہ بذریعہ ابو مکتوم ابن ابی ذر سنی، اور ہمارے شیخ ابو

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۱ ص ۲۵۰،

علیہ احمد بن زیادۃ اللہ غفاری نے مکہ میں ابو مکتوم سے سنا تھا، تو میں نے ان سے اکثر حصّہ سُن
لیا، اور بقیہ حصّہ کی انھون نے اجازت دیدی، ابو مکتوم کے واسطے سے سب سے آخر میں جس نے
روایت کی ہے، وہ ابوالحسن علی بن حمید بن عمار انصاری ہیں، انھون نے بطریق اجازہ حاصل کیا تھا
اور مین نے پوری کتاب اپنے استاذ ابو طالب صالح بن سند سے پڑھی جنھون نے اس
کو طرطوسی سے اور طرطوسی نے ابوالولید باجی سے سنا تھا"[1]

کتابون کی سند واجازہ میں یہ ضروری تھا کہ شیخ اپنے شیوخ کے واسطوں سے اپنی قرأت
وسماع کا سلسلہ اس کتاب کے مصنف تک پہونچائے، ورنہ وہ سند لائق اعتبار نہ سمجھی جاتی تھی ایسی
سندیں آج بھی عربی مدرسون میں رائج ہین،

نصاب تعلیم اسلامی نظام تعلیم میں علوم قرآن، تفسیر، حدیث، اصول، اصول فقہ وکلام اور مناظرہ
وغیرہ کی تحصیل مدرسہ کے ہر طالب علم کے لئے لازمی تھی، اور طالب علموں کے اسباق میں اسی ترتیب
بالا سے انھیں پہلے اور پیچھے جگہ دیجاتی تھی، ان کے علاوہ دیگر علوم حساب، ہیئت، طب، نجوم،
اور زراعت وغیرہ کی تحصیل اختیاری قرار دی گئی تھی، جس طالب علم کو جس
علم سے مناسبت ہوتی، وہ اسکی طرف رجوع کرتا تھا، اور اسی لئے ان علوم کی تحصیل مذہبی اصطلاح
میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، فرض کفایہ سمجھی جاتی تھی،[2] اس کے ساتھ مختلف علوم وفنون کے
معلم اس کا لحاظ رکھتے تھے، کہ وہ طالب علموں کے دلوں میں کسی خاص فن کی طرف سے حقارت
کا جذبہ پیدا نہ کرین، مثلاً فقہ کا معلم علم لغت کی برائیاں نہ کرتا، یا تفسیر اور حدیث کی تعلیم دینے والا علم
فقہ کو ہلکا کرکے نہ دکھاتا تھا،

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۸۶،

[2] تذکرۃ السامع ص ۳۵، ۳۶

تعلیم کے طریقہ میں یہ بات لائق ذکر ہے کہ علوم وفنون کی تعلیم میں اساتذہ اصل مطمح نظر اپنے فن کے اصل قواعد اور اصول طالب علموں کو اس طرح ذہن نشین کرا دیتے تھے، کہ انھیں فن میں حقیقی بصیرت حاصل ہو اور وہ خود سے ان کے دوسرے مسائل ان پر قیاس کر سکیں،[1]

طلبہ کے روزانہ کے اسباق کی ایک مثال

طالب علموں کے ذمہ روزانہ بہت سے اسباق رہتے تھے، علامہ ذہبی نے امام نووی کے روزانہ کے اسباق کی فہرست حسب ذیل درج کی ہے، وہ یہ ہے،

(۱) الوسیط (۲) الوسیط (دو سبق)، (۳) کتاب المہذب (۴) الجمع بین الصحیحین حمیدی (۵) صحیح مسلم (۶) کتاب اللمع ابن جنی، (۷)، اصلاح منطق، (۸) تصریف (۹) اصول (۱۰) اسماے رجال، (۱۱) اصول دین،

امام نووی ان گیارہوں حلقوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، اور ان کے تمام متعلقات مشکلات کی شرح عبارت کی توضیح اور لغتوں کے معنی وغیرہ روزانہ لکھتے بھی تھے،

بقدر استطاعت اسباق میں کمی کرنا،

اگر تعلیم کا بوجھ کسی پر زیادہ ہو جاتا تھا، تو وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس میں کمی کر دیتا تھا، چنانچہ امام نووی کو ان اسباق کی موجودگی میں طب پڑھنے کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے کتاب قانون خریدی، مگر وہ اس بوجھ کو سنبھال نہ سکے، اور علم طب کی تحصیل کا ارادہ ترک کرکے وہ کتاب فروخت کر ڈالی،[2] (باقی)

[1] تذکرۃ السامع ص ۵۰، ۱۱۰، [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۲۵۱،

آخری سلاطین مغلیہ کا علمی ذوق

از

سید صباح الدین عبد الرحمن، ایم، اے، رفیق دار المصنفین

اورنگ زیب کی روح قفس عنصری سے پرواز ہوتے ہی تاریخ ہند کا رخ بدل گیا، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کے لئے عالمگیر ہی کا دل و دماغ چاہئے تھا، مگر حکومت بدلنے کے ساتھ زمانہ بدلا، اور تاریخ بھی بدل گئی، تخت طاؤس وہی تھا، لیکن اس کے پردن کی خوشنمائی جاتی رہی تھی، تیموری دربار وہی تھا، لیکن اس کی رونق مٹ چکی تھی، ارباب عقل و دانش بھی موجود تھے، مگر ان کی جودت، فطانت اور سیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا، دیوان خاص کے کنگوروں سے حسرت و یاس برسنے لگی، دیوان عام کی دیواروں پر افسردگی چھا گئی اور قلعہ معلی سوگوار ہو گیا، معلوم نہیں یہ کارکنان قضا و قدر کی مصلحت تھی، یا عالمگیر کی اولادوں کے اعمال کی پاداش، تیموری سلطنت اوج کمال پر تھی، اس کے زوال کو روکنے کے لئے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی، مگر وہ قوت باقی نہ تھی، فطرت سرگرم ہوئی، اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم، بابل اور نینوا کا ہو چکا تھا،

عالمگیر کی دوررس نگاہیں اس نتیجہ تک پہونچ گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لائق جانشین چھوڑنے کے لئے جس قدر مضطرب اور بے چین رہا، کوئی اور تیموری حکمران نہ ہوا تھا، وہ ان کو نہ صرف میدان جنگ میں فنون سپہ گری و تدابیر رموز حکمرانی[1]، اور قلعہ معلی کے اندر لکھنے پڑھنے کی تعلیم

دلاتا تھا، بلکہ ان کو اوٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے، اور بولنے چالنے کے آداب خود سکھاتا تھا،[۱] مگر قدرت کو شاید منظور نہ تھا، کہ اسکی عظیم الشان سلطنت کے بارگراں کو اٹھانے کے لئے کوئی لائق جانشین پیدا ہو

بہر حال یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا، کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے ایام طفلی میں حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی، اور آگے چل کر قرأت و تجوید کا ماہر ثابت ہوا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ جب وہ قرآن پاک پڑھتا تو سامعین بہت محظوظ ہوتے تھے، علم حدیث سے وہ خاص دلچسپی رکھتا تھا، اور اس کو اسمیں اتنا درک تھا، کہ علماے حدیث اس کو سردار محدثین کے لقب سے یاد کرتے تھے، فقہی مسائل بلا تکلف قرآن و حدیث سے استنباط کرتا تھا، اس کے زمانہ میں جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ کے نام کے آگے لفظ "وصی" کے اضافہ کے سلسلہ میں جو جھگڑا پیدا ہوا، اسمیں علماء و فقہاء سے اس نے خود مناظرہ کیا،[۲] حدیث، فقہ، تفسیر و سلوک کی کتابیں برابر مطالعہ میں رکھتا تھا، مصنف مذکور کا بیان ہے کہ عربی زبان میں "عرب عربا" اور فارسی و ترکی زبانوں میں بہترین اہل زبان کے "ہم پلہ" تھا، فن خوشنویسی میں بقول مصنف ہذا "یکتاے زمانہ تھا"، اور مختلف قسم کے خطوط میں کمال حاصل کیا تھا،[۳] خلاصۃ التواریخ کا مصنف بھی اس کی تائید ان الفاظ میں کرتا ہے،

"و آن منتخب صحیفہ لیل و نہار باقتضاے سعادت فطری و میامن ترتیب حضرت خلد مکان از طلوع صبح تمیز از خارشر الف نفسانی و کمالات انسانی نمودہ و آن برگزیدہ روزگار ایام شباب بجز صرف علم تحصیل نمودہ، علم باعمل قرین ساخت سلامت و فصاحت تکلم عربی و ترکی و فارسی زیبائی و در اقسام تحریر خطوط مرتبہ استادی و رسائی اکثر شب را بادنوافل و تقدیم وظائف و قرأت قرآن مجید و مطالعہ کتب حدیث و تفسیر و فقہ و سلوک

[۱] عالمگیر نے شاہزادہ محمد سلطان بہادر کو جو شب و روز کا نظام اوقات لکھ بھیجا تھا، وہ رقعات عالمگیر مرتبہ نجیب اشرف ندوی ص۲۲ پر ملاحظہ ہو، [۲] خافی خان جلد دوم ص۶۴۳، [۳] مآثر عالمگیری ذکر اولاد ذکور،

زندہ می داشتند،..........[۱]

یا تو عالمگیری دربار کے زوال کے باعث یا شاہ عالمی عہد کے اختصار کے سبب سے دربار میں وہ فضا قائم نہ ہو سکی، جو اس کے اسلاف کے زمانہ میں تھی، اس لئے اس کا دربار علم و ہنر کی تابانی اور شعر و شاعری کی زمزمہ سنجی سے خالی رہا، گذشتہ عہد میں ایران سے علم و ادب کا جو سرچشمہ پھوٹا تھا وہ یکایک خشک ہو گیا، بلند پایہ شعراء اور قابل قدر فضلاء ناپید ہو گئے، قابل ذکر شعراء میں صرف عبد القادر بیدل اور نعمت خان عالی باقیات صالحات میں رہ گئے تھے، مرزا بیدل بہادر شاہ کے ایام شاہزادگی میں اس کے متوسلین میں ضرور تھے، لیکن درباری قصیدہ خوانی کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے شہزادہ معظم نے ایک بار قصیدہ کہنے کی فرمایش کی، تو دل برداشتہ ہو کر ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے، اور بقیہ عمر فقر و توکل میں بسر کی،[۲]

نعمت خان عالی کا ذکر گذشتہ مضامین میں آچکا ہے، بہادر شاہ نے اپنے زمانہ میں اسکو دانشمند خان کے خطاب سے سرفراز کیا، دانشمند خاں اس عہد کی منظوم تاریخ "شاہ نامہ" لکھ رہا تھا، کہ خود اس کی زندگی کا ورق الٹ گیا،[۳]

دربار کے دوسرے نامور شاعر یہ تھے،

میرزا مبارک اللہ مخاطب بہ ارادت خان المتخلص بہ **واضح**، خان اعظم شاہجہانی کا تیسرا

[۱] خلاصۃ التواریخ از سجان راے، قلمی نسخہ دار المصنفین، [۲] مآثر الکرام ص۱۴۸، دیوان کے علاوہ مرزا بیدل کی تصنیفات یہ ہیں، ۱۔ محیط اعظم، ۲۔ طلسم حیرت، ۳۔ گلگشت حقیقت، ۴۔ طور معرفت، ۵۔ عرفان، ۶۔ بیاض، ۷۔ نکات، ۸۔ رقعات، ۹۔ چہار عنصر، [۳] مآثر الکرام دفتر ثانی ص۱۳۷، نعمت خان عالی کی تصنیفات یہ ہیں، ۱۔ بہادر شاہ نامہ، ۲۔ وقائع حیدر آباد، ۳۔ رقعات نعمت خان، ۴۔ حسن و عشق، ۵۔ قصائد و قطعہ ہاو ہجوہا، ۶۔ ایک اخلاقی مثنوی (انڈیا آفس لائبریری، مخطوطات فارسی ص۹۰۳) (دیکھو ص)

لڑکا تھا، اورنگزیب کے زمانہ میں ارادت خان کا خطاب پایا، سنہ ۱۱۰۰ھ میں چاکنہ کی فوجداری پر مامور ہوا، پھر سنہ ۱۱۰۰ھ میں اورنگ آباد کی فوجداری اور اس کے بعد گلبرگہ کی قلعہ داری پر مقرر ہوا، شاہ عالم کے زمانہ میں منصب چہار ہزاری سے سرفراز ہوا، علم و فضل میں ممتاز تھا، صاحب مآثر الامرا کا بیان ہے:-

"مذاق تصوف داشت، و در شعر بسیار نازک خیال بود، واضح تخلص می کرد، صاحب دیوان است"[1]

انتخاب کلیات واضح (موجودہ انڈیا آفس لائبریری) میں چھ مثنویاں بھی ہیں جن میں صوفیانہ خیالات و مسائل منظوم کئے گئے ہیں،[2] تاریخ ارادت خان کے نام سے ایک تاریخ بھی لکھی، جو عالمگیر کی وفات سے لیکر فرخ سیر کے عہد کے واقعات تک پر مشتمل ہے،[3]

میرزا سید حسین خالص، عالمگیر کے زمانہ میں ایران سے ہندوستان آیا، امتیاز خان کے

[1] مآثر الامراء جلد اول ص ۲۰۵، اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

رشک فرمائے دلم نیست بجز عیش حباب . یافت یک پیرہن ہستی و آن ہم کفن است

عارف از و پراست ولی او نمی شود . آئینہ رونما شود و رونمی شود،

زمقراض فنا نور است شمع زندگانی را . بود آب دم شمشیر صندل سرگرانی را

چہ الفت است بزلف تو بیقراراں را . بلے سیاہ پسند است سوگواران را

موجم و وحشت کند محروم از ساحل مرا . در طپیدن رفت از کف دامن قاتل مرا

گلہ صاف بہ از عفو غبار آلود است . ہست دوزخ گنہی کہ بمدارا بخشد

بہار وقت صبا گل بکام گلچیں باد . کہ ما بہ کنج قفس طرح آشیاں کردیم

[2] انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ جلد اول ص ۹۰۵ [3] ایلیٹ جلد ہفتم، ص ۵۳۴ تا ص ۵۴۴

خطاب سے سرفراز ہوا، بہادر شاہ کے زمانہ میں میر آخور پادشاہی کے عہدہ پر مامور ہوا، ایران واپس جا رہا تھا، کہ راستہ میں سندھ کے پاس کسی نے قتل کر دیا، تاریخ وفات "آہ آہ امتیاز خان" سے نکلتی ہے، ایک دیوان یادگار چھوڑا، جس میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں، ایک مثنوی بھی اس کے نام سے منسوب ہے،[1]

قزلباش خان امید اصلی نام مرزا محمد رضا تھا، ہمدان کا رہنے والا تھا، بہادر شاہ کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور اس کے دامنِ دولت سے وابستہ ہوا، قزلباش خاں کا خطاب اور یک ہزاری منصب شاہی دربار سے ملا، چنانچہ خود کہتا ہے،

ہمچو بلبل ہمیشہ نالایم،

ایں بود منصب ہزاری ما

ایک فارسی دیوان چھوڑا،[2] ریختہ میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا، فن موسیقی کا بھی ماہر تھا،[3]

بندرابن داس بہادر شاہی مصنف خلاصۃ التواریخ کے علاوہ جگ جیون داس ولد منوہر داس بھی بہادر شاہ اول کے درباری متوسلین میں تھا، گجرات کا باشندہ تھا، سنہ ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ

[1] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ اسپرنگر ص ۱۵۰، ۱۴۱-۱۲۱-۱۱۱ [2] انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ جلد اول ص ۹۲۳ [3] اسپرنگر ص ۱۵۳، اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

روشن شود بہ بیش تو چوں شمع سوز من . یک شب اگر تو ہم نشینی بروز من

خوشا وقتے کہ می بالید از جاناں بر دوشم . برنگ ماہ نو ہر شام پر می گشت آغوشم

گشت رو گردان زبس آبادی از ویرانہ ام . چون کمان حلقہ بیرون شد درون خانہ ام

خدا نا کردہ اندوہت چرا از دوستاں باشد . شنیدم کلفتے داری نصیب دشمنان باشد

مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۱۰ اس کے ریختہ کے اشعار تذکرہ گلزار ابراہیم از میرزا علی متخلص بہ لطف میں ملاحظہ ہو،

نے لاہور کے دربار میں باریابی بخشی، اور وقائع نگاری کی خدمت پر مامور کیا، ۱۱۲۰ھ میں اوس نے منتخب التواریخ لکھ کر بارگاہ شاہی میں پیش کی، جس کے صلہ میں خطاب و خلعت اور انعام سے سرفراز ہوا[۱]

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے اقبال کا آفتاب اور بھی تیزی سے ڈھلنے لگا، تاریک بادلوں کے اندر سے کبھی کبھی امید کی شعاعین نکلتی بھی تھیں، تو ان میں نور کے بجائے ظلمت ہی نظر آتی تھی، تیموری دربار کا شیرازہ بکھر گیا، تدبر و سیاست میں انتشار آگیا، بیرونی فتوحات کی جگہ اب صرف خانہ جنگیاں رہ گئی تھیں، میدان جنگ میں خون آشامیوں کے بعد دربار قائم بھی ہوا، تو اس میں نہ اسلاف کی روایات تھیں، نہ ان کی متانت اور نہ ان کا وقار، بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ تخت نشین ہوا، گو اس کی حکومت کی مدت صرف دس مہینے رہی، لیکن اسکی بوالہوسی اور ہوسناکی نے شاہی دربار کی عزت و ناموس کو ایسا صدمہ پہونچایا کہ آیندہ تمام تیموری سلاطین کی حکومت محض تذلیل و تضحیک کی داستان بن کر رہ گئی، اس خانہ بربادی اور طوائف الملوکی میں علم و فضل کی مسند دربار میں بچھتی، تو کیونکر؟ محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر میں اسلاف کی علم پروری اور ادب نوازی کا خمیر موجود ضرور تھا، مگر ان کی شمع سحر میں ان کے اسلاف کے آفتاب نصف النہار کی ضوفشانی کہاں سے آتی، حکومت محض شام غریبان بن کر رہ گئی تھی، اس میں علما و فضلا کی بہار کہاں پیدا ہوتی،

فرخ سیر کی مدت حکومت سات سال رہی، اور یہ مغلیہ خاندان کا وہ زمانہ ہے، جب شاہی دربار میں مدبروں اور ہوشمندوں کا ایک قابل قدر اجتماع ہو گیا تھا، نظام الملک آصفجاہ کی سیاست، امیر الامرا سید حسین علی خان کی فراست، قطب الملک عبد اللہ کی فرزانگی اور میر جملہ کی مردانگی اگر ایک ساتھ متحد ہو جاتیں، تو کیا عجب تھا، کہ ایک بار پھر اکبری دبدبہ اور شاہجہانی

شوکت کی جھلک نظر آجاتی لیکن دربار کی ریشہ دوانیوں اور آپس کی فتنہ انگیزیوں نے تباہی اور بربادی کی چنگاریوں کو اس طرح مشتعل کیا، کہ سلطنت محض خاکستر ہو کر رہ گئی،

فرخ سیر کا ذوق علم و فضل سے عاری رہا، لیکن اس کے درباری امرا تدبر و فراست کیساتھ علم و ادب میں بھی ممتاز تھے، چنانچہ نظام الملک آصفجاہ ایک اعلیٰ مدبر ہونے کے علاوہ ادیب اور شاعر بھی تھا، خافی خاں اس کے بارے میں لکھتا ہے:-

"از علوم عقلی و نقلی کہ سرمایۂ حاصل زندگانی و کلید فتح ابواب ترقی دنیوی و نجات اُخروی است، بہرہ حاصل نمودہ و در ربط کلام نظم و نثر دست تمام دارد و شاکر تخلص می نماید، چنانچہ دو سہ بیت از زادۂ طبع آن بزرگ نژاد نگاشتہ می آید"

چوں گل بہ بوئے وصل گریبان دریدنی است ۔۔۔ آہے ز سوز سینہ بریاں کشیدنی است

زنہار دل بہ نقش و نگار جہاں مبند ۔۔۔ رنگے کہ دیدۂ ز رخ گل پریدنی است

شاکر برنگ برق درین عرصۂ خیال ۔۔۔ دامن ز خویش پر زدہ رہ دویدنی است[۱]

آصف جاہ کے بارے میں مآثر الکرام میں ہے:-

"نواب طبع موزونی داشت و دیوانے ضخیم از نتائج طبعش فراہم آمدہ"[۲]

امیر الامرا، سید حسین علی خان کے بیان میں صاحب مآثر الکرام رقمطراز ہیں:-

"امیر الامرا، خوش ذہن بود، و شعر خوب می فہمید و در فن تاریخ دانی منفرد می زیست و ارباب کمال را فراوان دوست می داشت و بعد نماز صبح اذن بود کہ صاحب کمال در آیند، و تا یک پاس روز با اینها صحبت می داشت و تاکید بود کہ در آن وقت دیوانیان و متصدیان حاضر نہ شوند،...... میر عبد الجلیل مرحوم تعریف خوش فہمی امیر الامرا بسیار می کرد"[۳]

[۱] خافی خان ص ۷۴۲، [۲] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۸۱، [۳] ر ص ۱۸۱،

آصفجاہ اور امیر الامراء دونوں علامہ سید عبد الجلیل واسطی بلگرامی کو بہت محبوب اور عزیز رکھتے تھے، علامہ موصوف فارسی عربی، ترکی، سنسکرت اور بھاشا کے فاضل اجل تھے، اور اپنے ذاتی تقدس اوصاف عالیہ اور علمی کمالات کے لحاظ سے اب تک عزت و وقعت سے یاد کئے جاتے ہیں، امیر الامرا سید حسین علی خان سے ان کے تعلقات کا حال صاحب مآثر الکرام کے الفاظ میں ملاحظہ ہو،

"امیر الامرا سید حسین علی کہ با ایشان الفتے خاص داشت و اکثر در مجالس خود بر ملا می گفت کہ میر عبد الجلیل درین عصر نظیر ندارند و لوازم احترام فوق الحد بتقدیم می رسانند"[1]

علامہ موصوف آصفجاہ کے حضور میں نواب امین الدولہ کی وساطت سے پیش کئے گئے تو

"نواب (آصفجاہ) اعزاز و اکرام فراوان بعمل آورد و برابر خود بے فاصلہ جا داد و چون نسخۂ قصیدہ از نظر گذشت، شمع را نزدیک طلبیدہ اشارہ بانشاد قصیدہ کرد، ہر یک بیت را بفہم در آوردہ بتوجہ تمام اصغا نمود و جواہر تحسین افشاند بعد استماع قصیدہ صلۂ نقد و خلعت و اسپ تکلیف فرمود، علامہ مرحوم موافق ضابطہ قدیم خود نپذیرفتند"[2]

علامۂ موصوف کو بھی ان دونوں سے بڑی شیفتگی تھی، آصفجاہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا اس میں اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :-

نظام ملت و ملک افتخار اہل کرم
قوام دین و دول آفتاب مجد و علا

چو او ندیدہ امیری مہذب الاخلاق
بعینک مہ و مہر این سپہر نشیب و دوتا

مثال روح مصور بود بپاکی ذات
نشان عقل مجسم بود بہ فہم و ذکا،

صفائی آئینہ رائے او بود چندان
کہ می نماید ازو آنچہ رو دہد فردا،

کرم ز دست گہر بار او بود ممنون
ظفر بہ تیغ چمن کار او بود شیدا

[1] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۶۳، [2] ، ص ۱۸۲

ہزار شکر کزو مسند وزارت یافت
ہمان کہ یافت تن عاذر از دم عیسےٰ

ملائک از پے آمین این دعا شدہ اند
برنگ نرگس و گل چشم و گوش فوق سما

ہمیشہ ہر دو زہم شاد و کامران باشند
وی از وزارت و از وی وزارت اعلیٰ[1]

امیر الامرار کے قتل سے علامۂ موصوف نے سینہ فگار ہو کر جو خونچکان ماتم کیا ہے وہ ملاحظہ ہو،

آثار کربلاست عیان از جبین ہند
زد جوش خون آل نبی از زمین ہند

شد ماتم حسین علی تازہ در جہان
سادات گشتہ اند مصیبت نشین ہند

نیلی است زین معاملہ پیراہن عرب
وز خون گریہ سرخ شدہ است آستین ہند

گیتی چرا سیاہ نہ گردد ز دود غم
خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند

ہند این چنین مصیبت عظمیٰ ندیدہ است
دیدیم داستان شہود و سنین ہند

از داغ دل زدند چراغان اشک جوش
این است نوبہار گل آتشین ہند

ماہی در آب می طپد و مرغ در ہوا
از شیون عظیم امیر مہین ہند

ہند از شہادتش تن بے روح گشتہ است
یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند[2]

فرخ سیر کے درباری امرا میں مرزا عبد المعالی عالی وزارت خان بھی شعر و شاعری میں طبع آزمائی کرتا تھا گرامی تخلص رکھتا تھا، مآثر الامرا میں ہے،

"وزارت خان متخلص بہ گرامی بحسنات سگرف سر آمد اوان بود، طبع موزون داشت صاحب دیوان است این شعر از و مشہور،

تا قافلہ سالار جنون فال سفر زد
دیوانۂ ما دامن صحرا بکمر زد"[3]

محمد شاہ | محمد شاہی عہد میں سادات کے قتل کے بعد خانہ جنگیوں کی کمی نسبتہً ضرور رہی، لیکن اس

[1] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۸۲، [2] ، ص ۷۳، ۷۲، ۱۷۱، [3] مآثر الامرا، جلد اول صفحہ ۲۶۷ ،

کے طویل زمانہ میں وہ تمام سامان ایک ایک کرکے جمع ہونا شروع ہوگئے، جو ایک عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے لئے ضروری ہیں، دربار میں اکبری اولوالعزمی کے بجائے شیشہ و پیمانہ کی بدمستی تھی، شاہجہانی شوکت و حشمت کی جگہ حسرت و یاس کی تصویر تھی، اور عالمگیری جاہ و جلال کی جگہ بے بسی اور بیکسی کا عبرتناک منظر تھا، بادشاہ وقت اپنے امراء اور درباریوں کے ہاتھ میں ایک بے جان آلہ کار رہگیا تھا، خود غرض امراء میں نہ نیت کی پاکیزگی تھی، نہ مقصد کی یکجہتی، رہی سہی قوت نادر خان کی خون ریزی، مرہٹوں کی غارتگری اور روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی، تیموریوں کی عظیم الشان حکومت کی بساط اب الٹنے کو تھی، صدیوں کا لگایا ہوا چمن ہمیشہ کے لئے ویران ہونے کو تھا، اور ایک پرشکوہ تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھرنے والا تھا،

سلطنت کا دبدبہ اور حکومت کی شوکت تو جا ہی رہی تھی، مغلیہ سلاطین اپنی زبان بھی کھو بیٹھے، دربار اور بازار میں فارسی کے بجائے اب ہندوستانی زبان کا اثر و اقتدار تھا، ایک حکمران قوم سے جب دولت گئی، حشمت گئی، اور زبان بھی گئی تو پھر اس کے مٹنے میں کیا دیر تھی، صرف وقت کا انتظار تھا،

محمد شاہ نے فارسی زبان کے بجائے ہندوستانی زبان میں اپنے علمی ذوق کا اظہار کیا، بارہ ماسہ اور بکٹ کہانی دو تصانیف اس کے نام کے ساتھ منسوب ہیں، اس نے ہندوستانی زبان میں طبع آزمائی بھی کی ہے، اشعار ملاحظہ ہوں،

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی	دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ گزری کا
کھول کر بند قبا دل کے تئیں غارت کیا	کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا
خوف سے مار کے یاراں اسے لرزاں کرو	زلف کا نام نہ لو اور پریشاں نہ کرو

مندرجۂ بالا اشعار کی زبان کتنی صاف ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی زبان دکن سے

شاہجہان آباد آگئی تھی، ولی دکنی دکن سے دہلی آئے، تو ان کی شاعری کا غلغلہ ہر طرف پھیلا، محفلوں میں ان ہی کی غزلوں کا چرچا ہوتا، ارباب نشاط ان ہی کی غزلیں گاتے، سنتے اور سر دھنتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کے کہنہ مشق اساتذہ بھی ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے، چنانچہ قزلباش خاں امید، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا علی قلی خان ندیم، اور مرزا مرتضیٰ قلی فراق جیسے باکمال فارسی شعراء نے بھی ریختہ میں اشعار موزوں کئے ہیں[۱]، یہی نہیں بلکہ تھوڑے دنوں کے اندر درباروں، مجلسوں اور بازاروں میں فیضی، نظیری، عرفی، طالب، قدسی، صائب اور کلیم کی بجائے مظہر، سودا، میر، درد، اثر، ذوق، مومن اور غالب کی زمزمہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں کا چرچا ہوگیا، شعراء کی تمام جولانیاں ہندوستانی زبان میں ہونے لگیں، مگر شراب وہی رہی صرف شیشہ و ساغر بدل گیا،

محمد شاہ کا عہد اس لحاظ سے نہایت ممتاز تھا، کہ اس میں بڑے بڑے ارباب فضل و کمال مجتمع تھے، فارسی شعراء میں قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان داؤد، علی قلی خان ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خان فراق، میر شمس الدین فقیر، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، فائز، شہرت، صابر، مخلص، ریختہ گوئی میں نواب عمدۃ الملک نواب عنایت خان راسخ، نواب محمد شاکر خاں شاکر، خان عالیشان جعفر علی خان، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ حاتم، میر ضاحک، میاں عبد الحئی تاباں، جعفر زٹلی، مرزا مظہر جانجاناں، اور ہندی شعراء میں اعظم خان دیوی کوی، صورت مسر وغیرہ موجود تھے، یہاں پر ہم صرف ان شعراء کا ذکر کریں گے، جن کا تعلق براہ راست محمد شاہ سے تھا،

انجام، امیر خاں نام اور نواب عمدۃ الملک خطاب تھا، عمدۃ الملک نواب امیر خاں عالمگیری کا بیٹا تھا، شعر و شاعری اور لطیفہ گوئی میں نہایت ستھرا مذاق رکھتا تھا، محمد شاہ کے نہایت محبوب

[۱] ان کی ریختہ گوئی کی مثال گلشن ہند مصنفہ مرزا علی لطف میں ملاحظہ ہو،

ہم جلیسوں میں تھا، تذکرۂ گلزار ابراہیم میں نواب موصوف کا ذکر اس طرح ہے،

"اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت بر آر ہوئی تھی کہ رشک تھا
ان سب ارکان دولت کو اور اعیان مملکت کو حسد تھا، لطیفہ گوئی کی طرف ان کی طبیعت
نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف، گردش چشم کے سمجھنے میں
زمانے کے استاد تھے، اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد، موجد ناز و انداز کی تہ
داریوں کے، اور اختراع کرنے والے چتون کی جادو کاریوں کے، گانے میں دخل ایسا تھا
کہ استاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور نادیدہ کی باتوں میں بڑے بڑے
گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے، بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا، کہ ایک
دم کی جدائی ان کی جہان پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی"[۱]

۱۱۵۶ھ میں شاہی دربار کی سازشوں سے قتل ہوا، فارسی اور ہندوستانی دونوں میں
اشعار کہتا تھا[۲] اس کا دربار شعرا کا مسکن بنا ہوا تھا، بذلہ سنجیوں کی محفلیں برابر گرم رہتی تھیں، زمانہ
کے تمام باکمال ارباب سخن اس کے یہاں جمع ہوتے، نواب عنایت خان راسخ اور نواب محمد شاکر
خان شاکر، پانی پت سے آکر شریک بزم ہوتے تھے، شرف الدین مضمون، خواجہ ناصر عندلیب
شاہ حاتم، میر ضاحک اور ہندی زبان کے شعرا میں انند گھن، دیوی کوی، اور صورت مصر بھی نواب

۱ گلزار ابراہیم (انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد) صفحہ ۱۴۲ تذکرۂ میر حسن میں ہے،
"نواب امیر خان از امرائے عظام و ظرفائے عالی مقام نواب عمدۃ الملک خوش طبع
و شیرین کلام از مقربان درگاہ فردوس آرام گاہ بود، لطائف و ظرائف او مشہور و معروف
است (ص ۵۴ مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ)

۲ ریختہ کے اشعار گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں،

موصوف کی علم پرور صحبتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، میر محمد شاکر ناجی نواب کے نعمت خانہ کے داروغہ
تھے[۱]، بندرابن خوشگو نے سفینۂ خوشگو اور تذکرۃ المعاصرین لکھ کر اس کی سرکار میں پیش کیں، اس نے
پوری قدر دانی کی، اور دو روپیہ روزینہ وظیفہ مقرر کیا[۲]،

خان عالیشان جعفر علی خان، مرزا مومن بیگ کا لڑکا تھا، ذہین، ذکی اور طباع شاعر
تھا، محمد شاہ نے سہ ہزاری منصب پر فائز کیا، محمد شاہ کی فرمایش پر "مثنوی حقہ" لکھنی شروع کی،
لیکن نامکمل رہ گئی، میاں حاتم نے اس کو پورا کیا[۳]،

شہرت شیخ حسین شیرازی عربی النسل تھا، لیکن ایران میں نشو و نما پائی، عالمگیر کے عہد
میں ہندوستان آیا، محمد اعظم کا طبیب مقرر ہوا، فرخ سیر نے حکیم الممالک کا خطاب دیا، محمد شاہ
کے عہد میں چہار ہزاری منصب سے سرفرازی حاصل ہوئی[۴]، ۱۱۴۹ھ میں وفات پائی، پانچ ہزار اشعار
کا ایک دیوان چھوڑا[۵]،

مصطفےٰ قلی خان یکرنگ تذکرۂ میر حسن میں ہے،

"در گلشن بہار سخن آب و رنگ و در چمن گلزار معانی بلبل خوش آہنگ مصطفےٰ قلی
خان المتخلص بہ یکرنگ مرد عمدہ بود، در عہد فردوس آرامگاہ نبیرۂ خان جہان لودھی در سلک
ملازمان بادشاہی منسلک بود[۶]"

رائے انند رام مخلص، مخزن الغرائب میں مخلص کا حال اس طرح درج ہے،

"وی از اعیان چھتریان است بہ صیغۂ وکالت نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خان بہادر

۱ گل رعنا صفحہ ۱۰۱، ۲ معارف نمبر ۲ جلد ۳ صفحہ ۱۶، ۳ تذکرۂ میر حسن صفحہ ۴۷، ۴ مآثر الکرام دفتر ثانی
صفحہ ۲۰۱، ۵ اسپرنگر صفحہ ۱۵۶، بوڈلین لائبریری میں اس کا دیوان موجود ہے، اشعار کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی
صفحہ ۲۰۳ پر ملاحظہ ہوں ۶ تذکرۂ میر حسن صفحہ ۲۱۷،

وفور الدین خان گوپاموی کہ ناظم صوبہ ارکاٹ دکن بودہ، درحضور محمد شاہ بادشاہ شرف اندوزی داشت، بسبب جانی دفر ہی از مجرائے بادشاہ باز ماندہ...... در شعر تلمذ از مرزا بیدل داشت، بعد ازان اشعار خود را از نظر خان آرزو گذرانیدہ، خانہ اش در شاہجہان آباد مسکن فضلا و شعرا بود[۱]

آنندرام مخلص نے تذکرہ کے نام سے ایک تاریخی کتاب بھی لکھی ہے، جسمیں نادر شاہ کے حملہ کے چشمدید واقعات ہیں (ایلیٹ جلد ہشتم ص۷۶)

لال رام، باپ کا نام رائے دولہ رام تھا، اس کا دادا، رائے گنجن، عالمگیری ملازموں میں تھا، لال رام محمد شاہ کی سرکار میں نوکر تھا، ۱۱۴۷ھ میں تحفۃ الہند ایک مستند تاریخی کتاب لکھکر دربار شاہی میں تحفہ پیش کی[۲]

محمد شاہ کا علمی کارنامہ علم ہیئت سے متعلق ہے، یہ کارنامہ اس کے درباری ہندو امیر راجہ جے سنگھ کچھواہا کے حسن ذوق، اور مساعی جمیلہ سے تکمیل کو پہونچا، جے سنگھ عالمگیر، اور اس کے جانشینوں کے عہد میں فوجی خدمت کے لئے ممتاز تھا، محمد شاہ کے عہد میں آگرہ اور مالوہ کا گورنر مقرر ہوا، جے سنگھ ایک کامیاب فوجی افسر اور باوقار حاکم ہونیکے علاوہ علم وہنر کا بھی سرپرست تھا، عربی علوم و فنون میں خاص دستگاہ رکھتا تھا، علم ہیئت سے اس کو بڑی دلچسپی تھی

۱ مخزن الغرائب قلمی نسخہ، دار المصنفین اعظم گڈھ، اسکے ریختہ کے اشعار تذکرہ میر حسن اور گلزار ابراہیم میں ملاحظہ ہوں، ۲ معارف نمبر ۲ جلد ۴۸ محمد شاہ کی علم کی نوازی کا پتہ اس سے بھی چلے گا، کہ ایک بار اس نے نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خان کو مرزا مظہر جانجاناں کے پاس بھیجکر کہلا بھیجا، کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا ہے اس میں جو کچھ چاہئے، قبول فرمائیے، لیکن مرزا صاحب کے استغنا کا یہ حال تھا کہ ہنس کر فرمایا، "قل متاع الدنیا قلیل" خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ

اس نے الغ بیگ کی زیچ جدید ملا چاند اکبری کی تسہیلات اور ملا فرید شاہجہانی کی زیچ شاہجہانی کے اصول پر زیچ محمد شاہی ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، اس فن سے محمد شاہ کی دلچسپی اور شغف کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس کے حکم سے مسلمان، برہمن اور فرنگی علمائے ہیئت جمع کئے گئے، اور ۱۱۳۷ھ میں دلی میں ایک جدید رصد خانہ کی تعمیر کا کام شروع ہوا، میرزا خیر اللہ مہندس اس کا مہتمم تھا، اس رصد خانے میں بعض آلات ایسے تھے، جو سمرقند کے الغ بیگی رصد خانے میں استعمال کئے جا چکے تھے، اور بعض خود راجہ مذکور کے ایجاد کئے ہوئے تھے[۱]

راجہ نے اس غرض سے کہ رصد خانے کی تمام تحقیقات صحیح ہوں اور ان کی تصدیق ہوتی جائے، دہلی کے رصد خانہ کے نمونے پر جے پور، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد خانے بنوائے ان رصد خانوں میں ہندو مسلمان، اور فرنگی علمائے ہیئت نے سات برس تک کام کیا، یہی نہیں بلکہ کچھ لوگ پادری مینوئل کی معیت میں یورپ گئے، اور وہاں سے جو معلومات اور تحقیقات حاصل ہوئیں، ان کا مقابلہ یہاں کے اصولوں سے کیا گیا، پھر ان تحقیقاتوں سے زیچ محمد شاہی تیار کی گئی، جو تین مقالات پر مشتمل ہے، اول در معرفت سنین، دوم در معرفت طالع ہر وقت، سوم در معرفت رفتار سیارات و ثوابت[۲] اس سلسلہ میں راجہ مذکور نے مزید قابل قدر خدمت یہ انجام دی، کہ عربی زبان کی مستند علم ہیئت کی کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کرایا، اور اس پر ہزاروں روپیہ صرف کئے[۳]

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸) میں آئی ہے وہ کتنی ہے کہ فقیر اسکی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے، (گل رعنا ص ۱۲۳)

۱ ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا مضمون "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی" (معارف نمبر ۵ ص ۲۲۹) ۲ ایضاً نیز دیکھو فہرست مشرقی کتبخانہ، پٹنہ، جلد یازدہم ص ۶۹ ۳ ملاحظہ ہو علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا مضمون ہذا،

محمد شاہ کے بعد مغلیہ سلطنت کی مدت کہنے کو تو ایک سو دس برس اور رہی، لیکن دلی کی حکومت بقول آزاد ایک "ٹوٹی پھوٹی ہوئی درگاہ" تھی، جس کے پانچ اور سجادہ نشین ہوئے، احمد شاہ[1] کی وفات پر شہنشاہ عالمگیر کے وارثوں کے قبضہ میں دوآبہ اور ستلج کے چند ضلعے رہ گئے تھے، گجرات مرہٹوں کی پامالی میں تھا، بنگال، بہار اور اڑیسہ، علی وردی خان کے جانشینوں کے تصرف میں تھے، اودھ میں صفدر جنگ کا پرچم لہرا رہا تھا، وسط دوآب میں بنگش حکمرانی کر رہے تھے، روہیلکھنڈ روہیلوں کے قبضہ میں تھا، پنجاب احمد شاہ درانی کو دیدیا گیا تھا، دکن میں نظام کی اولاد جھگڑ رہی تھی، ان کے علاوہ یوروپین طاقتیں علٰحدہ اپنے قدم جما رہی تھیں، ایسی حالت میں جب کہ تیموری سلاطین خود نان شبینہ کے محتاج ہونے کو تھے، علم و فضل کی سرپرستی کہاں سے کر سکتے تھے،

عالمگیر ثانی[2] کے المناک قتل کے بعد شاہ عالم بادشاہ ہوا، تو پہلے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار رہا، پھر مرہٹوں کے ہاتھ لال قلعہ کے اندر ایک معزز قیدی بنا، اور اس کے بعد غلام قادر کی سفاکیوں سے تیموری سلطنت کے فرمانروا کا جو انجام ہوا، وہ ارباب بصیرت کے لئے عبرت کا مقام ہے،

[1] اشرف علی خاں احمد شاہ کے کوکہ تھے، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے، اسلئے احمد شاہ نے انکو ظریف الملک کوکہ خان بہادر کا خطاب دیا تھا، (گلشن ہند از مرزا علی لطف ص ۱۸۲) [2] کہا جاتا ہے کہ عالمگیر ثانی نظام الدین اولیاء کے مزار مقدس پر بہو نگلر اپنی بادشاہت کے لئے دعا کیا کرتا تھا، جب تخت کا مالک بنا تو منقبت میں یہ اشعار کہے،

جو ہوئے خادم نظام الدین کا دل سے ای عزیز	اس کے تئیں ہوتا ہی تاج خسروی جگ میں نصیب
خادمی کی تھی عزیز الدیں نے باصدق و یقین	تاج شاہی ہند کا مجھ کو دیا ہے عنقریب
مرض دل افگار کا میرے وہ صحت بخش ہو	بے غذا و بے دعا و بے دوا و بے طبیب
بس پریشاں حال ہے اب خلق میں محبوب حق	فضل کر تقصیر واروں پر ہو تم حق کے حبیب

اسی قلعہ معلیٰ کے اندر جس کے مکینوں کی غضب آلود نگاہوں سے ہزاروں سرکش کانپ اٹھتے تھے، خود ان کی ایک اولاد ایک ظالم سرکش کے پنجوں میں گرفتار تھی، اسی پر جلال دربار کا ایک اورنگ نشیں جسکے اسلاف کی صولت و دبدبہ کے سامنے بڑے بڑے ارباب ثروت و حشمت سر عجز و نیاز جھکاتے تھے، ایک ستم ایجاد اور بے دردماغی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے تھا، جن کی ہیبت کے سامنے ارباب دانش پلک مارنا بھی سوء ادب سمجھتے تھے، ان کا ایک فرزند سر دربار بے حس و حرکت پڑا تھا، اور اس کے سینہ پر ایک شقی القلب روہیلہ سوار تھا، مال و دولت کی تلاش میں حرم کی دیواریں کھودی جا رہی تھیں، نازنینان حرم کے پھول سے رخسار طمانچوں سے سرخ کئے جا رہے تھے، شہزادیوں کے دیدۂ تر سے خون کی نہریں رواں تھیں، آہ و بکا کے شور سے قلعہ معلیٰ کے در و دیوار گونج رہے تھے، عین اسی حالت میں ایک ظالم "جفا جو" اور "کینہ پرور" روہیلہ نے

نکالی شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے

(اقبال)

شاہ عالم کو موت نہیں آئی، وہ پھر بادشاہ بنایا گیا، لیکن وہ بادشاہ نہ تھا، دنیا کے لئے عبرت کا درس تھا، اس نے اپنی بے کسی کا ماتم خود کیا ہے،

چہ حادثہ برخاست پئے خواری ما	داد بر باد سر و برگ جہانداری ما
آفتاب فلک رفعت شاہی بودم	برد در شام زوال آہ سیہ کاری ما
چشم من کندہ شد از جور فلک بہتر شد	کہ نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما
داد افغان بچہ شوکت شاہی بر باد	کیست جز ذات خدا کہ کند یاری ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش این بود	چیست امید کہ بخشد گنہ گاری ما

کردہ سی سال نظارت کہ مراداد بر باد   زود تر یافت تلافی ستمگاری ما

نازنینان پری چہرہ کہ ہم بزم بودند   کیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما

حق طفلاں کہ زسی سال فراہم کردند   کردہ تاراج نمودند سکبساری ما

عہد و پیمان عیاں دادہ نمودند دغا   محلیان خوب نمودند وفاداری ما

شیر دادیم بہ افعی بچہ پرور دیم   عاقبت گشت بجور پئے خونخواری ما

قوم افغان و مغلیہ ہمہ بازی دادند   بسکہ گشتند مجوز گرفتاری ما

این گدا زادۂ ہمدان کہ بہ دوزخ برود   بانی جور و ستم شد بہ دل افگاری ما

گل محمد کہ زمرواں بہ شرارت کم نیست   چہ قدر کرد وکالت پئے آزاری ما

نامراد[1] و سلیمان و بدل بیگ لعین   ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاری ما

شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من   زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما

مادھو جی سیندھیا فرزند جگر بند من ست   ہست مصروف تلافی ستمگاری ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند   چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

راجۂ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر   حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواری ما

نازنینان پری چہرہ کہ ہمدم بودند   نیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما

گرچہ[2] ما از فلک امروز حوادث دیدیم

باز فردا بدہ ایزد سر سرداری ما

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ شاہ عالم سخن گوئی میں کافی مہارت رکھتا تھا، اس کا تخلص آفتاب

[1] ایک دوسرے نسخہ میں نامراد کے بجائے الہ یار لکھا ہے۔

[2] 〃 〃 〃 گرچہ ما کے بجائے آفتاب ہے۔

تھا، فارسی اور ہندوستانی دونوں زبان میں اشعار موزوں کیا کرتا تھا، محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ "وہ بڑا مشاق شاعر تھا، جس کے چار دیوان اردو میں موجود ہیں[1]" لیکن انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ایک ہی جلد ہے[2]، برٹش میوزیم، بوڈلین[3]، اور اسپرنگر کی فہرست میں بھی ایک ہی کا ذکر ہے[4]، انڈیا آفس لائبریری کے دیوان میں شاہ موصوف کی ایک مثنوی موسوم بہ "منظوم اقدس" بھی شامل ہے، جس میں شاہ چین مظفر شاہ کا قصہ ہے، مولوی ذکاء اللہ کا بیان ہے، کہ "شاہ عالم نے نثر میں چار جلدوں میں ایک قصہ بھی لکھا ہے، جس سے ہر زمانہ کے ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ آدمیوں کا طرز معاشرت معلوم ہوتا ہے، اس کا نام شاہ عالم کا قصہ ہے[5]"۔

شاہ عالم نے اپنے عہد کے تمام ممتاز شعراء مثلاً سودا، میر، درد، نصیر، انشاء، زار، ممنون، احسان، قاسم اور فراق سے کچھ نہ کچھ ضرور واسطہ رکھا، جہاں دہلی کے تمام شعراء جمع ہو کر اپنی جولانی طبع دکھاتے تھے، وہاں شاہ عالم اپنی غزلیں بھیجتا تھا، سودا کو اپنا کلام دکھاتا تھا[6]، خواجہ میر درد کے یہاں محفل سماع میں شرکت کرنے کے لئے کئی بار گیا، ایک بار پانوں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکا، ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ صاحب اس کے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا کہ یہ امر فقیر کی آداب محفل کے خلاف ہے، شاہ عالم نے عذر کیا، اور معافی چاہی، خواجہ صاحب نے فرمایا اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی[7]، سید انشاء اللہ خان انشاء کو خاص طور سے بہت محبوب رکھتا تھا، ان کی ایک لمحہ کی جدائی اسکو گوارا نہ ہوتی تھی[8]، مگر عبرت کا مقام یہ ہے کہ جس کے اسلاف ایک ایک شعر کے صلہ میں شعراء کا منہ زر و جواہر سے بھرتے تھے، اور ان کو سونے چاندی

[1] آب حیات صفحہ ۱۷۳، [2] ملاحظہ ہو انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ جلد صفحہ ۹۳۲، [3] 〃 صفحہ ۲۰۷، [4] 〃 صفحہ ۳۱۸، [5] تاریخ ہندوستان جلد دہم صفحہ ۳۱۱، [6] آب حیات صفحہ ۲۴۲، [7] گل رعنا صفحہ ۱۳۳، [8] 〃 صفحہ ۱۷۱، [9] آب حیات صفحہ ۳۴۱،

یں تلواتے تھے، آج ان کے وارث کے پاس اتنا بھی نہ تھا، کہ اپنے محبوب شاعر کے بچوں کے لئے دو دو کھجوریں لیجانے کے لئے کچھ رقم دیتا،[1]

شاہ عالم کی اردو شاعری کے نمونے ملاحظہ ہوں:-

کیجئے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا / ہم تو بندے اس کے ہوں وہ یا ہو اغیار کا

خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سو اس نے آہ / ہو جیو یا رب بھلا اس چشم آتشبار کا

صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سو پکار / کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا

خون ہو دیگا گلوں کو دیکھنا ہرگز صبا / نام مت لینا چمن میں اس بت خونخوار کا

کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے / یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا

دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب / کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا

صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ / ڈھونڈھ جا کر ہر طرف نقش قدم دلدار کا

اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہی آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا،

صبح تو جام سے گزرتی ہے، / شب دل آرام سے گزرتی ہے،

عاقبت کی خبر خدا جانے، / اب تو آرام سے گزرتی ہے،

ولہ

تصور ترا جس کو اے یار ہوگا / اُسے غیر سے کیا سروکار ہوگا،

مرا لخت دل اشک میں ڈھونڈنا / اسی قافلہ میں وہ سالار ہوگا،

دیا دل تو ہے آفتاب اُسکو لیکن / خدا جانے کیا عاقبت کار ہوگا،

[1] آب حیات صفحہ ۲۴۶،

ولہ

چھیڑنے کا تو مزہ یہ ہے کہو اور سنو / بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

ولہ

آئے جو خواب میں بھی وہ یوسف لقا کبھی / اے آفتاب دولت دیدار سمجھئے

جوں شمع تا سحر شب فرقت میں آفتاب / بے اختیار مجھ کو رولاتی ہے چاندنی

تری اس مانگ سے کیا معنی دلخواہ ہے پیدا / شب معراج کی اس خط کو گویا راہ ہے پیدا

مدت سے اشتیاق ہے پیارے جو آئیے / بٹھلا رواق چشم میں سیریں دکھائیے

(باقی)

[1] یہ اشعار تذکرۂ گلزار ابراہیم (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) تذکرۂ ہندی مصنفہ مصحفی اور گلشن بیخار سے لئے گئے ہیں،

مقدمۂ رقعات عالمگیر

از سید نجیب اشرف ندوی ایم اے

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہی مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے مآخذ، اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات وسوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے، لکھائی چھپائی، کاغذ نہایت عمدہ، ضخامت ۴۵۰ صفحے، قیمت للعہ

"منیجر"

فن عروض کی جدید تشکیل

از

پروفیسر عبدالمجید صاحب ایم اے، پٹنہ کالج

فن عروض جس شکل میں بزرگوں سے ہم تک پہنچا ہے وہ میرے خیالِ ناقص میں طلبہ کے لئے نہ صرف مشکل ہی ہے بلکہ اس کا ایک معتدبہ حصہ غیر ضروری بھی ہے، میں نے اس فن کو پڑھانے میں اکثر محسوس کیا کہ اس کی موجودہ شکل میں بہت کچھ ترمیم اور تنسیخ کی ضرورت ہے اور اگر تھوڑی توجہ سے اس کام کو کیا جائے تو یہ ضروری فن طلبہ کے لئے اس قدر خوفناک نہ رہے، جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، اس ضرورت کو غالبًا موجودہ دور کے اکثر اساتذہ اور مصنفینِ فن نے محسوس کیا ہے اور انھوں نے اس کی کوشش بھی کی ہے کہ اس فن کو کسی قدر آسان بنائیں، لیکن یہ کوشش صرف اسی قدر ہوئی کہ بعض غیر مستعمل بحریں ترک کردیں، یا صرف کثیر الاستعمال زحافات کا ذکر کیا باقی کو چھوڑ دیا، غرض تسہیلِ فن میں کوئی اصولی کوشش نہیں کی گئی ہے، میری ناچیز کوشش جو آپکے سامنے ہے ایک اصولی کوشش ہے اور باوجودیکہ اس صورت میں یہ فن بہت مختصر اور سہل ہوگیا ہے لیکن عروض کے اجزاء، بحور، زحافات وغیرہ تمامہا اس میں شامل ہیں،

عروض کی اس جدید تشکیل کا اصول یہ رکھا ہے کہ مختلف چیزیں جو کسی ایک عام قاعدہ کے تحت آسکتی ہیں، انھیں اس قاعدہ کے ماتحت لاکر سہولت اور اختصار پیدا کیا جائے،

آپ دیکھیں گے کہ بحریں افاعیل سے بنتی ہیں اور افاعیل صرف آٹھ ہیں اس لئے اصلی بحریں صرف آٹھ ہی ہونی چاہئیں، نہ کہ انیس، مفرد بحریں درحقیقت سات ہی ہیں، بقیہ بارہ بحریں

ان ہی سات بحروں سے مرکب ہوتی ہیں، اس لئے میں نے سات بحریں مفرد اور اصلی قرار دیں اور بارہ بحریں ان ہی کے تحت میں لاکر مرکب قرار دیں، چنانچہ طالب العلم کو اب بجائے انیس بحروں کے صرف آٹھ بحروں کے نام اور ان کے ارکان یاد کرنے پڑیں گے، مرکب بحروں کے نام اور ارکان اُن ہی سے یاد ہوجائیں گے،

اسی طرح کثیر التعداد زحافات ایسے ہیں جن کا عمل ایک ہی ہے، مثلاً کسی متحرک حرف کو ساکن کرنا، اب یہ عمل اگر مفعولاتُ میں ہوتا ہے تو اس کا نام وقف ہے اور مُتَفَاعِلُن میں ہوتا ہے تو اس کا نام اضمار اور مفاعلتن میں ہوتا ہے تو اس کا نام عقب ہے، میں نے ان تینوں مختلف ناموں کے بجائے ایک کام کیلئے ایک ہی نام قرار دیا، اس طرح مفرد زحافات جو ستائیس تھے پندرہ رہ گئے، اور مرکب زحافات جو سولہ تھے وہ مفرد زحافات میں شامل ہوگئے، غرض زحافات کی مجموعی تعداد جو تینتالیس تھی اب صرف پندرہ رہ گئی،

اس صورت میں ہر اوسط درجہ کا طالب العلم اس فن کو حافظہ پر غیر ضروری بار ڈالے بغیر چند دنوں میں حاصل کرسکتا ہے، ممکن ہے کہ میری کوشش میں بعض خامیاں یا فروگذاشتیں ہوں لیکن اگر اربابِ فن میرے اصول سے اتفاق کریں تو مزید اصلاح اور ترمیم ہوسکتی ہے، میں تمام اہلِ فن سے متوقع ہوں کہ اس ناچیز کوشش پر نظرِ توجہ ڈالیں گے اور اپنے خیالات سے مجھے سرفراز فرمائیں گے،

"عبدالمجید، پٹنہ کالج"

سالم بحور کے ناموں میں تخفیف

انیس بحروں میں سات بحریں مفرد ہیں، بقیہ بارہ بحریں ان ہی مفرد بحروں سے مرکب ہوئی ہیں، اور ان کے نام الگ الگ رکھدیئے گئے ہیں، اس وجہ سے انیس بحروں کے نام یاد کرنے پڑتے ہیں، اگر مرکب بحروں کے نام بھی مرکب رکھدیئے جائیں

تو صرف سات مفرد اور ایک مرکب بحر یعنی آٹھ بحروں کے نام یاد کرنے پڑیں گے، ان کی صورت یہ ہوگی،

(۱) **بحر ہزج**، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مثمن سالم،

(۲) **بحر رجز**، مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن، "

(۳) **بحر رمل**، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، "

(۴) **بحر متقارب**، فعولن، فعولن، فعولن، فعولن، "

(۵) **بحر کامل**، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن، متفاعلن، "

(۶) **بحر وافر**، مفاعلتن، مفاعلتن، مفاعلتن، مفاعلتن، "

(۷) **بحر متدارک**، فاعلن، فاعلن، فاعلن، فاعلن،

(۸) **رجز مرکب**، مفعولات اور مستفعلن کی ترکیب سے جو بحریں بنی ہیں انکا نیا نام رجز مرکب رکھا گیا،

(الف) مستفعلن، مفعولاتُ، مستفعلن، مفعولاتُ، مثمن (اس بحر کا نام منسرح تھا)

(ب) مفعولاتُ مستفعلن، مفعولاتُ، مستفعلن، " (اس بحر کا نام مقتضب تھا)

(ج) مستفعلن، مستفعلن، مفعولاتُ، (مسدس) (اس بحر کا نام سریع تھا)

(۹) **ہزج، رمل یا رمل ہزج**،

(الف) مفاعیلن، فاعلاتن، مفاعیلن، فاعلاتن، مثمن، (اس بحر کا نام مضارع تھا)،

(ب) مفاعیلن، مفاعیلن، فاعلاتن، مسدس (اس بحر کا نام قریب تھا)

(ج) فاعلاتن۔ مفاعیلن، مفاعیلن، مسدس (اس بحر کا نام مشاکل تھا)

(۱۰) **رمل رجز** (الف) فاعلاتن، فاعلاتن، مستفعلن، مسدس (اس بحر کا نام جدید تھا)

یا رجز رمل (ب) فاعلاتن مستفعلن، فاعلاتن، مسدس، (اس بحر کا نام خفیف تھا)

(ج) مستفعلن، فاعلاتن، مستفعلن، فاعلاتن، مثمن، (اس بحر کا نام مجتث تھا)

(۱۱) **رجز۔ متدارک**، مستفعلن، فاعلن، مستفعلن فاعلن (اس بحر کا نام بسیط تھا)

(۱۲) **متقارب۔ ہزج**، فعولن، مفاعیلن، فعولن، مفاعیلن، مثمن (اس بحر کا نام طویل تھا)

(۱۳) **رمل۔ متدارک**، فاعلاتن، فاعلن، فاعلاتن، فاعلن، مثمن (اس بحر کا نام مدید تھا)

مفرد زحافات

کئی کئی زحافات مختلف ارکان پر ایک ہی عمل کرتے ہیں لیکن نام سب کے جدا جدا ہیں ہیئت نے اس قسم کے واحد العمل زحافات کو یکجا کرکے ایک کے لئے صرف ایک نام قرار دیا ہے اور ستائیس زحافات کو صرف پندرہ زحافات میں جمع کر دیا ہے، اب طالب العلم کو صرف ان ہی پندرہ زحافات کو یاد کر لینے سے کل زحافات پر عبور ہو جائے گا،

۱۔ **اسکان**، کسی حرف کو ساکن کرنا جیسے مفعولاتُ سے مفعولاتْ، متفاعلن سے متْفاعلن مستفعلن، مفاعلتُن سے مفاعلْتن، مفاعیلن (مسکن)

وقف[1]، اضمار[2] اور عصب[3] کی جگہ صرف ایک نیا نام اسکان رکھا گیا

۲۔ **خرم**، کسی رکن کے پہلے حرف کو گرا دینا، جیسے مفاعیلن سے فاعیلن = مفعولن سے فعولن، فعولن سے عولن = فعْلن، مفاعلتن سے فاعلتن = مفتعلن، (اخرم)

خرم[4]، ثلم[5] اور عضب[6] کی جگہ صرف ایک نام خرم رکھا گیا،

۳۔ **جبن**، کسی رکن کے دوسرے حرف کو گرا دینا جیسے فاعلن سے فعلن، فاعلاتن سے فعلاتن، مستفعلن سے متفعلن، مفاعلن، مفعولاتُ سے معولاتُ، فعولاتُ، متفاعلن سے مفاعلن، (مخبون)

جبن[7] و وقص[8] کی جگہ ایک زحاف صرف جبن رکھدیا گیا،

[1] وقف، مفعولات کی ت کو ساکن کرنا [2] اضمار، متفاعلن کی ت کو ساکن کرنا [3] مفاعلتن کی ت کو ساکن کرنا [4] خرم پہلے وتد مجموع کے پہلے حرف کو گرا دینا جیسے مفاعیلن سے فاعیلن = مفعولن [5] ثلم، فعولن سے پہلے حرف کو گرا دینا [6] عضب، مفاعلتن سے پہلے حرف کو گرا دینا [7] جبن، دوسرے حرف ساکن کو گرا دینا [8] وقص، دوسرے حرف متحرک کو گرا دینا،

۴- **طی**، کسی رکن کے چوتھے حرف کو گرا دینا، جیسے مستفعلن سے مُستَعِلُن = مفتعِلن، مفعولات سے مَفعُلات - فاعلاتُ، مفاعلتن سے مفاعِلتُن، مفاعلن۔ (مطوی)

طی[1] اور عقل[2] کی جگہ صرف ایک ہی زحاف طی رکھدیا گیا،

۵- **قبض**، کسی رکن کے پانچویں حرف کو گرا دینا، جیسے مفاعیلن سے مفاعلن، فعولن سے فعولُ۔ (مقبوض)

قبض[3] اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی،

۶- **کف**، کسی رکن کے ساتویں حرف کو گرا دینا جیسے مفاعیلن سے مفاعیلُ، فاعلاتن سے فاعلاتُ، مستفعلن سے مستفعلُ، مفعولاتُ سے مفعولا، مفعولن، (مکفوف)

کف[4] و کسف[5] کو ملا کر صرف ایک نام کف رکھدیا گیا،

۷- **حذف**، کسی کے اول یا آخری سبب خفیف کو گرا دینا، جیسے مفعولاتُ سے عولاتُ۔ مفعولُ۔ فعولن سے فعوُ، فَعُل، مفاعیلن سے مفاعی، فعولن، (محذوف)

یہاں رفع[6] اور حذف[7] کو ملا کر صرف ایک نام حذف رکھدیا گیا،

۸- **صلم**، کسی رکن کے آخری وتد کو گرا دینا جیسے مفعولاتُ سے مفعوُ، فِعلُن، فاعلن سے فا، فعْ، مستفعلن سے مستفْ، فِعلُن، متفاعلن سے متفا، فَعِلُن (اصلم)

صلم[8] و حذذ[9] کو ملا کر صرف ایک نام صلم رکھدیا گیا،

۹- **جبت** - مفاعیلن کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا، مفاعیلن سے مفا، فَعَل (مجبوب)

جبت[10] اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی،

۱؎ طی۔ چوتھے حرف ساکن کو گرا دینا، ۲؎ عقل چوتھے حرف متحرک کو گرا دینا ۳؎ قبض، پانچویں حرف ساکن کو گرا دینا ۴؎ کف، ساتویں حرف ساکن کو گرا دینا، ۵؎ کسف، مفعولات کی تُ (ساتویں حرف متحرک) کو گرا دینا، ۶؎ رفع۔ پہلے سبب خفیف کو گرا دینا، ۷؎ حذف، آخری سبب خفیف کو گرا دینا ۸؎ صلم، مفعولاتُ (یعنی آخر رکن سے) وتد مفروق کو گرا دینا، ۹؎ حذذ۔ آخر رکن کے وتد مجموع کو گرا دینا، ۱۰؎ جبت مفاعیلن کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا،

۱۰- **جدع**۔ مفعولاتُ کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا اور تُ کو ساکن کرنا، مفعولاتُ، لاتْ، فاعْ (مجدوع)

جدع[1]

۱۱- **قطع**، رکن کے آخری حرف کو گرا دینا اور اس کے قبل کے حرف کو ساکن کرنا، جیسے مفاعیلن سے مفاعیلْ، فاعلاتن سے فاعلاتْ یا فاعلان، فعولن سے فعولْ، فاعلن سے فاعل، فِعلُن، مستفعلن سے مستفعِل، مفعولن، متفاعلن سے متفاعلْ، فَعِلاتن، (مقطوع)

قصر[2] و قطع[3] کو ملا کر صرف ایک نام قطع رکھدیا گیا،

۱۲- **تسبیغ**۔ کسی رکن کے نون (ن) کے قبل الف بڑھانا جیسے مستفعلن سے مستفعلان، فاعلن سے فاعلان، متفاعلن سے متفاعلان، مفاعیلن سے مفاعیلان، فعولن فعولان، فاعلاتن سے فاعلاتان، (مسبّغ)

اذالہ[4] و تسبیغ[5] دونوں کو ملا کر صرف ایک نام تسبیغ رکھدیا گیا،

۱۳- **ترفیل**، رکن کے آخر میں ایک سبب خفیف بڑھانا، جیسے متفاعلن سے متفاعلن، تن، متفاعلاتن، مستفعلن سے مستفعلن، تن، مستفعلاتُن، فاعلن سے فاعلن، تن، فاعلاتن؛ (مرفل)

ترفیل[6] اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

۱۴- **تشعیث**، فاعلاتن کو مفعولن بنانا، (مشعث)

تشعیث[7] اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

۱۵- **نحر**۔ مفعولاتُ اور فاعلاتن سے فَعْ بنانا، (منحور)

یہاں دو زحافوں نحر[8] و سلخ[9] کو ملا کر ایک نام نحر رکھدیا گیا،

۱؎ جدع، مفعولاتُ کے دونوں سبب خفیف کو گرا دینا اور تُ کو ساکن کر دینا ۲؎ قصر، رکن کے آخری سبب کے حرف ساکن کو گرا دینا اور اس کے قبل ساکن کر دینا، ۳؎ قطع، رکن کے آخری وتد مجموع سے آخر حرف کو گرا کر اس کے قبل کے حرف کو ساکن کرنا، ۴؎ اذالہ، کسی رکن کے آخری وتد مجموع میں الف بڑھانا، ۵؎ تسبیغ، رکن کے آخری سبب خفیف میں الف بڑھانا، ۶؎ ترفیل، آخری وتد مجموع پر ایک سبب خفیف بڑھانا، ۷؎ تشعیث، وتد مجموع کے پہلے یا دوسرے متحرک حرف کو گرا دینا، فاعلاتن سے فالاتن یا فاعاتن ہو کر مفعولن کے برابر ہو گیا، ۸؎ نحر، مفعولاتُ کے دونوں سبب خفیف کو اور تُ کو گرا دینا، فع، ۹؎ سلخ - فاعلاتن سے فع بنانا،

مرکب زحافات | مرکب زحافات تعداد میں سولہ[16] ہیں اور ہر ایک کا نام علٰحدہ ہے، میرے خیال ناقص میں ان مرکبات کے خاص ناموں کے بجائے اگر ان کو ان مفرد زحافوں سے موسوم کیا جائے جن سے ان کی ترکیب ہوئی ہے تو ان خاص سولہ[16] ناموں کی بالکل ضرورت نہیں رہے گی، مثال کے طور پر خرب کو پیش کرتا ہوں جو کف اور خرم سے مرکب ہے، اب جس بحر میں یہ زحاف ہو اسکو اخرب نہ کیا جائے بلکہ اس کو مکفوف اخرم سے موسوم کیا جائے، (کف و خرم کی تعریف مفرد زحافات میں معلوم ہو چکی ہے) اس طرح سولہ[16] ناموں کی تخفیف ہو جائے گی، اور صرف ان ہی زحافوں کی تکرار ہوگی جن کا ذکر میں نے مفردات میں کیا ہے،

۱- **خرب**۔ کف و خرم کا ایک جگہ جمع ہونا، جیسے مفاعیلن سے فاعیلُ، مفعولُ، — اس زحاف کو خرب نہیں کہینگے، بلکہ جس بحر میں یہ زحاف ہو اس کو مکفوف اخرم کہیں گے،

۲و۳- **شتر**، قبض و خرم کا مفاعیلن میں جمع ہونا، **ثرم**۔ قبض و خرم کا "فعولن میں جمع ہونا، مفاعیلن سے فاعلن اور فعولن سے عولُ، فعل ہوا، — اس کا نام مقبوض اخرم ہوگا،

۴- **بتر**[1]۔ حذف و قطع کا فاعلاتن و فعولن میں جمع ہونا یا خرم و جب کا مفاعیلن میں جمع ہونا، فاعلاتن سے فاعل، فعْلن، مفاعیلن سے فا، فع اور فعولن سے فع، — اس کا نام محذوف مقطوع ہوگا (فاعلاتن اور فعولن میں) یا اخرم مجبوب ہوگا، (مفاعیلن میں)

۵- **شکل**۔ جبن اور کف کا جمع ہونا جیسے فاعلاتن سے فعلاتُ، — اس کا نام مجنون مکفوف ہوگا،

[1] فاعلاتن اور فعولن میں حذف و قطع کے جمع ہونے کو اور مفاعیلن میں خرم اور جب کے جمع ہونے کو بتر کہتے ہیں، یعنی بتر کی دو تعریفیں ہیں،

۶- **قصم**، عصب و خرم کا جمع ہونا، جیسے مفاعلتن سے فاعلتن، مفعولن، — اس کا نام اخرم مسکن ہوگا، (عضب کا نام میں نے مفرد زحاف میں اسکان رکھا ہے)

۷- **ہتم**، حذف و قصر کا جمع ہونا جیسے مفاعیلن سے مفاع، فعولْ، — اس کا نام محذوف مقطوع ہوگا (مفرد زحاف میں میں نے قصر کو قطع کے تحت میں کر دیا ہے)

۸- **زلل**، خرم و ہتم کا جمع ہونا جیسے مفاعیلن سے فاعْ، — محذوف مقطوع اخرم اس کا نام ہوگا، (ہتم چونکہ خود ایک مرکب زحاف ہے، اس لئے اس کے تین مفرد نام ہوے)

۹- **نقص**، عصب اور کف کا جمع ہونا جیسے مفاعلتن سے مفاعلْتُ، مفاعیلُ، — اس کا نام مسکن مکفوف ہوگا، (عصب کا نیا نام خود زحاف میں اسکان رکھا گیا ہے)

۱۰- **خلع**۔ جبن و قطع کا جمع ہونا جیسے مستفعلن سے متفعلْ، فعولن، — اس کا نام مجنوں مقطوع ہوگا،

۱۱- **عقص**۔ خرم و نقص کا جمع ہونا جیسے مفاعلتن سے فاعلتْ، مفعول، — اس کا نام اخرم مسکن مکفوف ہوگا، (چونکہ نقص خود ایک مرکب زحاف ہے، اس لئے اس کا نام تین مفرد زحافوں پر مشتمل ہے)

۱۲- **خبل**، جبن و طی کا جمع ہونا جیسے مفعولاتُ سے معلاتُ، فعِلاتُ، — اس کا نام مجنون مطوی ہوگا،

۱۳- **خزل**، اضمار و طی کا جمع ہونا، جیسے متفاعلن سے متفعِلن، مفتعِلن، — مسکن مطوی (مسکن، مضمر کی جگہ ہے)

۱۴- **جمم**۔ خرم و عقل کا جمع ہونا جیسے — اخرم مسطوری، (عقل کی جگہ طی ہے)

مفاعلتن سے فاعلتن وفاعلن،

۱۵- **ربع** - جبن و بتر کا جمع ہونا جیسے فاعلاتن سے فعلُ — مجنون محذوف مقطوع (دیکھو بتر کی تعریف)

۱۶- **قطف** - عصب و حذف کا جمع ہونا جیسے مفاعلتن سے مفاعل، فعولن؛ — مسکن محذوف،

چند نئی کتابیں

دلّی کا سنبھالا - از خواجہ محمد شفیع دہلوی (مرحوم) دہلی کے ایام عروج کی مرقع نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے، جواب نابود ہے، انداز بیان ایسا مؤثر ہے کہ دل بے اختیار ہوجاتا ہے، قیمت عہ

لطائف غالب، مسٹر ایم اے شاہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شوخی بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اسے ضرور پڑھئے، قیمت ۳ ر

سبد چین، مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں ان کے وہ فارسی قطعات، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں جو ان کی کلیات میں موجود نہیں ہیں، ۱۲

ذکر غالب، مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند ترین سوانح عمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں اور جو طلبہ کے لئے خاص طور سے بہت مفید ہے، قیمت ۸ ر

قرآن کیا ہے اور اس نے کیا کر دکھایا (از عبد الواحد سندھی) استاذ مدرسہ جامعہ بچوں کی نفسیات، شعور اور استعداد کو مد نظر رکھکر تیار کی گئی ہے، مسلمان بچوں کے لئے اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی، قیمت: ۶ ر

دلّی - بچوں کے لئے دلی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان جس کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ تیار کی گئی ہے، بلاک کی ۶ تصاویر دو نقشے، قیمت ۴ ر

مکتبہ جامعہ، دہلی، نئی دہلی، لاہور

تلخیص و تبصرہ

سیرت کا مولد

ڈاکٹر اوسوالڈ شوارز (Oswald Schwarz) پروفیسر ویانا یونیورسٹی کا ایک پرمغز مقالہ "سیرت کا مولد" (The Birthplace of Character) کے عنوان سے ہبرٹ جرنل بابت اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے، مضمون کی اہمیت کا تقاضا ہے، کہ ناظرین کے غور و فکر کے لئے اس کا پورا ترجمہ پیش کر دیا جائے:-

جدید علم النفس کے اہم ترین انکشافات میں سے ایک انکشاف یہ ہو کہ ہماری راحت و مسرت نیز ہمارے تمام مصائب، مشکلات، مسائل، اور غیر معمولی کیفیات جو زندگی میں آگے چل کر پیش آتی ہیں، انکی بنیادیں تقریباً ہمیشہ ہمارے بچپن کے ابتدائی چند سالوں میں رکھی جاتی ہیں، یہی وہ نظریہ ہے جسے اس مقالہ میں ثابت کرنا ہے،

(۱)

یہ صحیح ہے کہ چونکہ ہم اپنے والدین کے وجود مادی کا حاصل ہیں، اس لئے ان کی بعض کیفیات و خصوصیات ورثہ میں پاتے ہیں، لیکن اہلِ سائنس اور اُن سے زیادہ عامی لوگ توارث کی اہمیت میں بہت زیادہ مبالغہ کرتے آئے ہیں،

ایک ناتجربہ کار شخص مشکل اس انتہائی وقت کو یقین کرے گا، جو یہ متعین کرنے میں پیش

آتی ہے، کہ آیا کوئی مخصوص کیفیت موروثی ہوسکتی ہے، یا کسی خاص صورت میں یہ ورثہ میں حاصل کی گئی ہے، کیونکہ ابھی تک ہمیں انتقال پذیر کیفیات کی کوئی فہرست معلوم نہیں ہوسکی ہے، لیکن تجربہ سکھاتا ہے کہ کسی کیفیت کو موروثی قرار دینے میں بہت احتیاط کرنی چاہئے، کیونکہ مزید تجربہ سے اکثر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک خصلت جو بظاہر موروثی معلوم ہوتی ہے، وہ گرد و پیش کے حالات کا ردِ عمل ہے، یہ بات خصوصیت کے ساتھ ہر قسم کے جذبات کی نسبت صحیح ہے، اصلی (موروثی) اور ثانوی (ماحولی) خصائل کے درمیان امتیاز کرنے کا واحد قابلِ اعتماد طریقہ یہ ہے، کہ احتیاط و محنت کیساتھ ان تمام خصوصیات کی تفتیش و تحقیق کیجائے، جو قبل اس کے کہ بچہ میں اپنے ماحول کا اثر متعین طور پر قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہوسکے ظاہر ہو جاتی ہیں،

حسب ذیل وہ معدودے چند خصوصیات ہیں، جن کو اکثر ماہرین علم النفس بالاتفاق اصلی خیال کرتے ہیں:۔

۱۔ حرکت پذیری (Mobility) دو ماہ اور اس سے زیادہ عمر کے بچوں میں دیکھا گیا ہے، کہ ایک بچہ دوسرے بچہ کے مقابلہ میں تین سو گنا زیادہ حرکت خود بخود بلا تحریک غیر کرتا ہے، پس پھرتی اور سستی کے درمیان وسعت بہت زیادہ ہے،

۲۔ قوتِ رفتار (Tempo or Speed) ایک بچہ اپنی جسمانی حرکتون نیز اپنی دماغی سرگرمیون میں خلقی طور پر سست یا پھرتیلا ہوسکتا ہے،

۳۔ قوتِ واہمہ (Phantasy) یہ چیز ان متعدد اور مختلف طریقوں میں ظاہر ہوتی ہے، جو بچہ معمولی کھیل کی چیزون کے استعمال کرنے میں خود اپنے جی سے اختیار کرتا ہے، اسکی جانچ ۶ ماہ سے اٹھارہ ماہ تک کی ابتدائی عمر میں بھی ہوسکتی ہے، اور اسکی زیادتی صفر سے ساٹھ درجہ تک ہوتی ہے،

۴۔ استقلال (Perseverance) اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے، کہ بچہ کتنی دیر تک ایک قسم کے کھلونے سے از خود کھیل جاری رکھ سکتا ہے،

۵۔ قوتِ اختراع (Initiative.) اپنے کھلونے کو سلیقہ کے ساتھ استعمال کرنیکی قابلیت، اسکی جانچ چھ مہینے کی عمر سے ہوسکتی ہے،

۶۔ صحبت پسندی (Sociability) اس لحاظ سے بچّون کی تین قسمیں چھ مہینے کی عمر سے واضح طور پر نظر آتی ہیں، جب وہ یکجا ہوں گے، تو ایک بچہ دوسرے بچہ کی طرف بڑھیگا یا اس کے کھلونے چھینے گا، دوسرا بچہ ان پیش قدمیون یا حملوں کو چپ چاپ بغیر کسی مزاحمت کے گوارا کرے گا، تیسری قسم کا بچہ اپنے ہی کھلونون سے کھیلنے میں مگن رہتا ہے، اور دوسرے بچوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا،

۷۔ ذکاوت (Intelligence) بلاشبہ موروثی چیز ہے، جون جون بچہ بڑھتا ہے، ذکاوت ترقی کرتی جاتی ہے، لیکن اس کے امکانی حدود توارث سے متعین ہوچکے ہیں، چنانچہ تعلیم یا زندگی کے تجربات سے ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی،

۸۔ مخصوص اوصاف (Specil endowments.) مثلاً موسیقی ریاضیات، نقشہ کشی، فنی اور صنعتی مہارت، اور مختلف زبانوں کے لئے طبیعت کی خاص مناسبت اس چیز کو انتقال پذیر سمجھنا چاہئے،

خلقی خصائل کی یہ وہ مختصر فہرست ہے، جسے تجربی نفسیات نے حد درجہ احتیاط کیساتھ گذشتہ چند سالون میں مرتب کیا ہے، ان تحقیقات کی سائنٹفک قدر و قیمت کو کم کرکے دکھلائے بغیر یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا، کہ عملی نقطۂ نظر سے اس فہرست کی قیمت ان مشکلات و مسائل کے سامنے بہت کم رہ جاتی ہے، جو فرض کیجئے کہ چودہ سال کے ایک ایسے لڑکے کے معاملہ میں

پیش آتے ہیں، جو کاہل، سست یا آمادہ بے کار ہے، یا جس میں ایجاد و اختراع یا استقلال وغیرہ کی کمی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر پسندیدہ یا ناپسندیدہ خصلت خلقی بھی ہو سکتی ہے، اور اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ کی چودہ[۱۴] سال کی زندگی میں پیدا ہو گئی ہو، اگرچہ گذشتہ تیس سالوں میں تحلیلی نفسیات (Analytic psychology) نے بہت کچھ ترقی کر لی ہے، تاہم کسی شخص کے اصلی اور ثانوی خصائل میں فی البدیہہ امتیاز کر لینا اب بھی ناممکن ہے، خصائل کی یہ دونوں قسمیں باہم اس قدر مشابہ ہیں، اور ماحول کے اثرات اتنے مکمل طور پر فطری اور جبلی ملکہ کو بدل دے سکتے ہیں، کہ ان دونوں قسموں میں کسی تیقن کے ساتھ فرق کرنا اسی وقت ممکن ہے، جب کامل احتیاط اور دقتِ نظر کے ساتھ کسی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے، اسی لئے جدید علم النفس نے یہ اصول اختیار کیا ہے، کہ اس قسم کے تمام ناپسندیدہ خصائل جیسے استقلال کی کمی، ضد، کاہلی، ہمہ تن متوجہ نہ ہو سکنا، ظاہرداری وغیرہ (اور بعض پسندیدہ خصائل بھی مثلاً حُبِ جاہ، جراُت، کسی چیز سے مخصوص طور پر دلچسپی لینا، اطاعت وغیرہ) کو حاصل کردہ سمجھنا چاہیے، اور اس بنا پر ان کا نفسیاتی تدبیر کے اثر سے تغیر پذیر ہونا بھی تسلیم کر لینا چاہیئے، صرف اسی وقت جب تدبیر بالکل ناکام ثابت ہو جائے، جیسا عملاً کبھی نہیں ہوتا، یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ بعض خصائل ممکن ہے، کہ خلقی اور جبلی رہے ہوں، اور ان میں تغیر نہ ہو سکتا ہو، جدید علم النفس کی یہ بات قابلِ ستائش ہے، کہ اس نے یہ امیدانہ انداز تعلیم میں جاری کر دیا،

(۲)

جیسا کہ ہم پہلے سے جانتے ہیں، یہ ثانوی (حاصل کردہ) خصائل بچہ پر خاندان کے اثر کا نتیجہ ہوتے ہیں، لہذا اس امر پر زور دینے کی ضرورت نہیں، کہ ایک معمولی، اور اس سے بڑھکر ایک غیر معمولی بچہ کی نفسیات کا قابلِ اعتماد علم صرف خاندان کی نفسیات کی بنا پر ہو سکتا ہے، خاندان آدمیوں کی

کوئی بھیڑ نہیں ہے، اور نہ وہ کوئی اتفاقی اجتماع ہے، بلکہ وہ ایک وحدت ہے، ایک معین ڈھانچہ ہے جس کا ہر جزو یا رکن تمام دوسرے اجزا، یا ارکان سے مربوط و متحد ہوتا ہے، اثراندازی اور اثر پذیری کا ایک سلسلہ ہے، جو مستقل طور پر جاری رہتا ہے، اور ہر رکن کا وجود و کردار ایک ناقابلِ یقین حد تک تمام دوسرے ارکان کے وجود و کردار کا نتیجہ اور ردِ عمل ہوتا ہے،

معمولی ساخت کا خاندان ایک باپ اور ایک ماں پر مشتمل ہوتا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کا ایک معین رتبہ ہوتا ہے، باپ لازمی طور پر خاندان کا حقیقی افسر ہوتا ہے، اس کا قدرتی احترام کیا جاتا ہے، اپنے روزگار کے ذریعہ سے وہ خاندان کی پرورش کرتا ہے، اور تمام مشکلات میں سب سے بڑا حکَم مانا جاتا ہے، معاشرتی ذمہ داری کا حقیقی بار اسی پر ہوتا ہے، ان تمام باتوں میں ماں کا درجہ باپ کے بعد ہوتا ہے، لیکن اپنے خاص دائرہ میں وہ خود مختارانہ طور پر حکمرانی کرتی ہے، خاندان کا مکمل توازن قائم رکھنے کے لئے بچوں، لڑکوں، اور لڑکیوں دونوں کی معیاری تعداد اب تین خیال کیجاتی ہے،

اگر خاندان کے ڈھانچ کے توازن میں کسی طرح کا خلل واقع ہوا تو بچہ کی شخصیت کی نشو و نما کا غیر معمولی ہو جانا یقینی ہے، جن ناموافق حالات سے یہ بات پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:-

باپ یا ماں کی قبل از وقت موت، والدین کی جدائی، بچہ کا اکلوتا ہونا، بچہ کا ولد الحرام ہونا، ماں یا باپ یا کسی ایک بچہ کا دوسرے بچوں پر حد سے زیادہ اثر و اقتدار رکھنا وغیرہ،

ان تمام عناصر کے مجموعہ سے وہ چیز بنتی ہے، جس کو ہم خاندان کی "فضا" کہتے ہیں، یہی فضا خواہ متوازن، موافق اور خوشگوار ہو، یا کشیدہ، افسردہ کن اور اضطراب انگیز، بچہ کی نشو و نما کا حقیقی فیصلہ کن عنصر ہے، بس تعلیمی نفسیات کا پہلا بنیادی اصول ہم یہ قائم کر سکتے ہیں:-

"اصلی اہمیت اسکی نہیں ہے، کہ ہم والدین کیا کہتے یا کرتے ہیں، بلکہ اسکی کہ ہم کیا ہیں"۔

بچوں میں کسی شخص کی اصلی ہستی کے احساس کی حیرت انگیز استعداد ہوتی ہے، اُن سے کسی
چیز کا چھپانا ممکن نہیں، وہ ہر بہروپ کے اندر اصلیت کو دیکھ لیتے ہیں، اس جرمن مقولہ میں بڑی
دانائی ہے، کہ "بچے اور بے وقوف سچی بات کہتے ہیں" یہ دیکھ کر نہایت افسوس ہوتا ہے کہ وہ
تمام کوششیں جو والدین اپنی ذہنی اور جذباتی مشکلات کو اپنے بچوں سے پوشیدہ رکھنے میں
صرف کرتے ہیں، کس درجہ بیکار ثابت ہوتی ہیں، ممکن ہے کہ بچے ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ سکیں، کہ دراصل
واقعہ کیا ہے، لیکن انھیں کشاکش اور سختی کا احساس ہو جاتا ہے، یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں سے کونسی
چیز بچوں کے لئے زیادہ مصیبت کا باعث ہوتی ہے، ازدواجی زندگی کے مصنوعی رکھ رکھاؤ
کا کشیدہ ماحول یا ایک شریفانہ طلاق کی ناموافق صورتِ حالات یہ کہنا نوعِ انسانی کی نیکی سے انکار
کرنا نہیں، بلکہ محض اظہارِ حقیقت کرنا ہے، کہ بچے کبھی نکاح کی بندش کو مضبوط نہیں کرتے،
بلکہ صرف طلاق کو زیادہ دشوار بنا دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کو تعدیل و تحدید کے ساتھ
منطبق کرنا چاہئے، دراصل بچہ کی شخصیت پر صرف والدین کے طرزِ زندگی، انکی مثال اور ان کے
پیدا کردہ ماحول کا اثر پڑ سکتا ہے، چنانچہ بچوں پر والدین کے اس اثر کی قدر و قیمت جو کسی خاص
غرض سے ڈالا جاتا ہے، جدید خیال کے مطابق بہت کم ہو جاتی ہے، لیکن وہ اثر کلیۃً فضول
نہیں ثابت ہوتا، کیونکہ جو ہدایات و معلومات —— تعلیم سے علٰحدہ —— والدین
دیتے ہیں، ان کا اثر شخصیت کی زیادہ سطحی تہوں پر ضرور پڑتا ہے، اور وہ طور و طریقۂ اخلاق عادات
اور طرزِ معیشت کو کسی خاص انداز پر لگا دیتی ہیں، —— ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی کے لئے
ایک اصول کا رہبر ہو جاتی ہیں،

(۳)

اب ضرورت ہے کہ بچوں سے متعلق باپ اور ماں کے فرائضِ منصبی کی کیفیت زیادہ

تفصیل کے ساتھ بیان کیجائے، آئیے پہلے ماں سے شروع کریں، انسان اپنی زندگی کے طویل
سفر پر اپنی ماں کے جسم سے روانہ ہوتا ہے، اور اس حیاتیاتی امر واقعہ کا مثل نفسیاتی میدانِ عمل
میں بھی موجود ہے، اپنی ماؤں کی ذات سے ہمیں ایک ایسی زمین کا شعور ہوتا ہے جس میں ہماری
جڑیں قائم ہیں، اس دنیا میں ایک ایسی جگہ کا جو تمام تر ہماری ہے، ایک ایسے انسانی وجود کا
جس کے ساتھ ہم غیر منفک طور پر جڑے ہوئے ہیں، مختصر یہ کہ ماں انسان کو اس دنیا کی
بے کرانی میں ایک گھر دیتی ہے، یہ سراسر اہم تجربہ اس کے اندر استحکام، حفاظت اور طبیعت کے سکون
و توازن کا شعور پیدا کرتا ہے، یہ چیز اُن تمام تعلقات پر اثر ڈالتی ہے، جو وہ بعد کو اپنے ماحول کے
ساتھ قائم کرتا ہے، اپنے بچہ کے ساتھ ماں کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ بچہ کی شخصیت کو پوری
طرح تسلیم کرتی ہے، اور کامل ایثار کے ساتھ اس کی قدر پہچانتی ہے، بے چون و چرا اور غیر مشروط
طور پر، اور بلا لحاظ اس کے کہ یہ صحیح ہے یا غلط، اس میں اپنی فطری خود پسندی کو مستقل بنیاد پر قائم
کرنے کے لئے اسی مکمل اعتراف و قدر شناسی کی ضرورت ہے، جس شخص نے کبھی یہ سچی قدر شناسی
اپنی ماں سے نہیں پائی ہے، وہ تمام عمر اس قسم کی محبت کی تلاش میں قرونِ وسطیٰ کے بانکے کی
طرح مارا مارا پھرتا رہے گا، اسکی تلاش بے سود ہوگی، کیونکہ یہ محبت نہ صرف یکتا و بے مثل ہے اور
محبت کے کسی دوسرے طرز سے اس کا بدل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ صحیح وقت پر
دی جانی چاہئے، اسبیل تذکرہ میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ حقیقی مادری محبت کی یہ کمی ازدواجی
زندگی کی بہت سی ناکامیوں کی ذمہ دار ہوتی ہے، انسان کی شاہ راہ حیات کو بجا طور پر ایک لمبی
سڑک کہہ سکتے ہیں، جس میں چھپے ہوئے گڑھے بکثرت ہیں، یہ سڑک ایک عورت یعنی ماں سے
شروع ہو کر بچپن، نوجوانی اور پختگی کے دور سے گذرتی ہوئی، ایک دوسری عورت یعنی بیوی تک
پہونچتی ہے، اور مادریت کا خلقی طور پر شاید سب سے زیادہ دردناک پہلو یہ ہے کہ ماں اپنے لڑکے کو

ایک دوسری عورت کے لئے جنتی اور اسکی پرورش اور پرداخت کرتی ہے، بہتیرے آدمی جن کو صحیح وقت پر یہ مادری محبت نہیں ملی ہے، زندگی میں آگے چل کر اپنی بیوی سے اس چیز کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے اپنے بچپن میں وہ محروم رہ چکے ہیں، اس سے بڑھکر امید موہوم اور کیا ہو سکتی ہے، وہ بجائے اس کے کہ بیوی کو طمانیت بہم پہونچائیں، خود اس سے اس چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں، اور بیوی سے اس مادری اور پر ایثار قدرشناسی کی توقع رکھتے ہیں، جسے وہ اپنی شخصیت کے حقوق کو قربان کئے بغیر پورا نہیں کر سکتی، بکثرت ازدواجی تعلقات ان بنیادی غلط فہمیوں کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں، اور ان بدقسمت بیویوں کو اپنے شوہروں کی ماؤں کے پرانے قرضے ادا کرنے پڑتے ہیں،

مادری محبت بھی شاید انہی جذباتی مظاہرے میں سے ہے، جن کو بیان کرنا حد درجہ مشکل ہے، یہاں ہمیں صرف غلط قسم کی محبت کے بیان پر قناعت کرنی چاہئے، ہم اس قسم کی ماں کا ذکر نہ کریں گے، جو اپنے بچہ کی محبت مطلق محسوس نہیں کرتی، یا جو بعض ایسے اسباب کی بنا پر مثلاً بچہ کا غیر مطلوب ہونا، اپنی فطری محبت کو دبا ڈالتی ہے، ہم صرف اسی قسم کی ماں سے بحث کریں گے، جو دراصل اپنے بچہ سے محبت کرتی ہے، اور جسے یہ معلوم کرکے نہایت تشویش ہوگی، کہ وہ غلط طریقہ سے محبت کرتی ہے، یا جس جذبہ کو وہ محسوس کر رہی ہے، وہ مادری محبت کے علاوہ کوئی چیز ہے،

ماں کی ایک قسم جو اکثر ملتی ہے، وہ ہے، جسے ہم "پالنے والی ماں" (Nursing Mother) کہہ سکتے ہیں، اس اصطلاح کو اس کے وسیع ترین معنوں میں لینا چاہئے، یہ عورتیں اپنے بچوں کی انتہائی دیکھ بھال، ان کی راحت رسانی، انھیں ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھنے اور تمام حقیقی اور خیالی دشواریوں میں ان کی مدد کرنے میں بعض اوقات اپنی ساری زندگی قربان کر دیتی

ہیں، لیکن بچے بغیر کسی اعتراف یا ممنونیت و احسانمندی کے احساس کے ان تمام باتوں کو قدرتی اور ان ساری قربانیوں کو اپنا حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں، یہ مائیں مایوسی کی حالت میں اپنی ضرر رسیدہ برباد زندگیوں پر نظر ڈالتی ہیں، اور مایوسی ہی کی حالت میں یہ بچے بھی گلہ کرتے ہیں، کہ ماؤں نے اُن کی مساعدت نہیں کی، کیونکہ اگرچہ ان ماؤں نے اپنے بچوں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جیسا ایک بہترین قسم کی میزبان عورت اپنی مہمانوں کیساتھ کرتی ہے، تاہم جس چیز کی بچوں کو حقیقۃً ضرورت تھی اسے بہم پہونچانے سے یہ مائیں معذور تھیں ——— یعنی گھر اور ماں کی محبت کا ایک ناقابل بیان جز

ماں کی ایک دوسری قسم وہ ہے، جو اپنے بچوں کو محبت کے وفور و غلو میں غرق کر دیتی ہے، اور انھیں اس محبت کا قیدی اور غمگسار بنا لیتی ہے، ان میں سے اکثر عورتوں کی زندگیاں نہایت ناشاد و غمگین ہوتی ہیں، خصوصاً ان کی ازدواجی زندگی کی تمام امیدیں ٹوٹ چکی ہوتی ہیں، اور اب وہ اپنی ساری دبی ہوئی اور ناکام محبت کو اپنے بچوں پر نثار کر دینا چاہتی ہیں، یہاں بھی بچے یہ محسوس کرتے ہیں، کہ یہ اس قسم کی محبت نہیں ہے، جسکی انھیں ضرورت ہے، وہ اسکی افراط سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں، کہ ہم اس محبت کے حقیقی مقصود نہیں ہیں، بلکہ کسی اور شخص کے عوض اور قائم مقام ہیں، ان کا غیر فریب پذیر وجدان انھیں بتاتا ہے، کہ یہ محبت فی الاصل ایک خود غرضانہ محبت ہے، جس کا اظہار اُن سے زیادہ خود ماں کی بعض ذاتی احتیاج کو پورا کرنے کی غرض سے کیا جاتا ہے ——— یعنی اس میں دینے سے زیادہ لینا ہے

میں بہ سبیل تذکرہ ماں کی اُس مشہور و معلوم قسم کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں، جسکی کم و بیش غیر معمولی شخصیت بچوں کو محبت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ مضرت پہنچا دیتی ہے، خواہ براہ راست، خواہ گھر کی فضا کو درہم برہم کرکے بالواسطہ طور پر، مثلاً بے حد حساس، جابر اور اسی نوع کی دوسری مائیں،

(باقی) "ع ز"

اخبار علمیہ

برقی صدمے اور موت

اہل سائنس کی جدید تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بجلی کے صدمہ سے جو بظاہر موت ہو جاتی ہے، وہ اصل میں موت نہیں ہوتی، بلکہ اس سے محض اعصاب مفلوج ہو جاتے ہیں، اگر بارہ گھنٹے مسلسل جسم میں مصنوعی سانس پہونچائی جائے، تو بجلی کے صدمہ سے مرا ہوا انسان زندہ ہو سکتا ہے، نیویارک کے ڈاکٹر لیونگسٹن فیرس نے ہزاروں بھیڑوں گائے کے بچھڑوں، اور بلیوں پر اس قسم کے تجربے کرکے دکھایا ہے، کہ بجلی کے تیز وولٹ کے صدمے سے سانس صرف رک جاتی ہے، مختلف پٹھوں کی رگیں منتشر ہو کر ایک ساتھ مل کر کام کرنے سے بیکار ہو جاتی ہیں اور نبض کی حرکت بند ہو جاتی ہے

اس سلسلہ میں یورپ کے ایک ڈاکٹر نے کتوں اور بلیوں کے سینوں میں شیشے کے آلات پیوست کرکے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے، وہ یہ کہ ان جانوروں کے جسم میں برقی صدمے پہونچائے گئے، اور ان سے ان کے مختلف اعضاء پر جو اثرات مترتب ہوتے رہے، ڈاکٹر شیشے کے ذریعہ سے دیکھتا رہا، چنانچہ اب یہ بالکل واضح ہو گیا ہے، کہ اگر ایک برقی صدمہ کے بعد دوسرا پہلے سے بھی زیادہ زوردار صدمہ فوراً ہی جسم کو پہنچا یا جائے، تو قلب کی رگیں منتشر ہونے سے بچ جا سکتی ہیں، اور نبض کی حرکت پھر جاری ہو سکتی ہے، اسی سلسلہ میں یہ بھی انکشاف ہوا ہے، کہ برقی لہروں کے ذریعہ سے دوسرے قسم کے اعصابی صدمون کا بھی علاج ہو سکتا ہے، مثلاً اگر چھری کے گہرے زخم میں ہلکی سی برقی لہر

پہنچائی جائین، تو زخم جلد مندمل ہو سکتا ہے، یا موٹر اور اسی قسم کی گاڑیوں کے حادثون کی شدید ضرب کا بھی برقی لہروں سے کامیابی کیساتھ علاج ہو سکتا ہے، بجلی کے تیز وولٹ کے صدمے کا علاج بھی ممکن ہے، اس کے ذریعہ سے مصنوعی سانس پہنچا کر پھیپھڑے حرکت میں لائے جاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ تیز وولٹ کے صدمے کے مارے ہوئے آدمی بچا لئے گئے ہیں، گو اس میں کچھ دیر لگی ہے، ابھی حال ہی میں اوہیو کے ایک نوجوان نے جو زندگی سے عاجز تھا، ایک بجلی گھر کے سب سے اونچے حصہ پر چڑھ کر جان دینے کی کوشش کی، لیکن اتفاق سے اس کا جسم بجلی کے ایک ایسے تار سے جس میں ۳۳ ہزار وولٹ کی طاقت تھی چھو گیا اور نوجوان کے جسم میں بجلی غیر معمولی سرعت کے ساتھ سرایت کر گئی، اور وہ تیس فیٹ نیچے زمین پر آ گرا، لیکن فوری تدبیروں سے بچا لیا گیا اس کے چند ہفتون بعد ایک اکسرے کا ماہر بھی ایک ایسے بجلی کے تار کی زد میں آ گیا، جس کا وولٹ ۵، ہزار تھا، وہ بیہوش ہو گیا، لیکن فوراً ہی اس کے جسم میں مصنوعی آکسیجن پہونچایا گیا، اور اس میں پھر جان آ گئی، اسی طرح نیویارک کے بجلی گھر میں ایک شخص ارنسٹ ہیگلنڈ نامی نے ایک تار چھو دیا، جس کا وولٹ ،، ہزار کے قریب تھا، اس صدمے سے اس کے دل کی حرکت فوراً بند ہو گئی لیکن اس کا علاج جاری رہا اور وہ اچھا ہو گیا، حالانکہ لوگوں کو بظاہر اسکی موت کا یقین ہو چکا تھا،

امریکہ کے بعض مجرموں کو بجلی کے ذریعہ سے موت کی سزا دیجاتی ہے، ان کو بجلی کی کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے، اور چار منٹ کے اندر وہ زندگی سے محروم کر دیئے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے، کہ اس سے کم سے کم تکلیف پہونچتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، تکلیف کی زیادتی یا کمی کا ٹھیک اندازہ تو کوئی مرا ہوا مجرم زندہ ہو جائے تو وہی بتا سکتا ہے لیکن حال ہی میں ایک برقیات کے ماہر نے اپنا تجربہ بیان کیا کہ اتفاق سے اسکو بجلی کا صدمہ پہونچا، تو اسکو یکایک ایسا معلوم ہوا، کہ اسکی ساری ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں، رگیں پھٹ رہی ہیں، اور اسکے سارے جسم میں بہت ہی تیز آتشین سوئیاں چبھ رہی ہین، اور وہ پندرہ منٹ کے

نے بظاہر مرگیا، اگر مناسب طبی امداد سے بچ گیا، بعض محققون کا خیال تھا کہ مجرمون کی لاش لیکر انکو زندہ کرنیکی کوشش کیجائے لیکن عدالت نے اسکی اجازت نہ دی حالانکہ ۱۹۰۵ء ہی میں نیویارک کے ڈاکٹر رابنو وچ نے بعض جانوروں کو بجلی سے مار کر زندہ کر دکھایا ہے اسوقت سے ابتک تو بہت سی اور نئی تحقیقات ہو چکی ہیں، اسلئے امریکہ کے اہل الرائے میں بجلی کے ذریعہ سے مجرموں کو موت کی سزا دینا پھر سے غور طلب ہو گیا ہے،

حضرت سلیمانؑ کا بندرگاہ

انجیل میں ایک جگہ ذکر آتا ہے، کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں بحر احمر میں ایک بندرگاہ بنایا تھا، مگر اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا تھا، کہ یہ بندرگاہ کہاں واقع تھا، ابھی گذشتہ مئی میں ہیل کے ڈاکٹر میلر برو نے خبر دی ہے، کہ اس بندرگاہ کا پتہ چل گیا ہے اور وہ عقبہ کے پاس ہے، چنانچہ یہاں ڈاکٹر گلک کی نگرانی میں کھدائی کا کام شروع ہو گیا ہے، عقبہ بحر احمر کے شمالی حصہ میں بالکل آخر میں ایک تنگ خلیج پر واقع ہے، جسکے چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں، یہ پہلے ترکوں کے قبضہ میں تھا، لیکن جنگ عظیم میں کرنل لارنس نے عربی فوجوں کی مدد سے ترکوں کو یہاں سے بے دخل کر دیا،

ابتک اس بندرگاہ کے معلوم نہ ہونیکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ موجودہ ساحل سے نصف میل کی مسافت پر زمین کی سمت واقع ہے، ڈاکٹر گلک کی تحقیقات ہے، کہ حضرت سلیمانؑ کے بندرگاہ کے لوگ بحری تجارت جہاز سازی اور ماہی گیری کے علاوہ تانبا پگھلانے کا کام بھی کیا کرتے ہیں، اور مختلف اوزار مثلاً مچھلیاں پکڑنے اور مچھلی مارنے کے آلات بنایا کرتے تھے، ان اوزاروں میں جو شگاف بنائے گئے تھے، وہ ابتک قائم ہیں، یہ شگاف شمالی ہوا کے اثرات سے بنتے تھے، اسی فطری فائدہ کی بنا پر یہ بندرگاہ اس جگہ پر قائم کیا گیا، اور یہاں تانبے کا کام شروع ہوا، ان کھودنے والوں کا خیال ہے، کہ جب حضرت سلیمانؑ کی یہ بحری تجارت شروع ہوئی، تو ملکہ سبا کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں یہ تجارت اسکے قافلہ والوں کی تجارت میں خلل انداز نہ ہو، اسی لئے وہ حضرت سلیمانؑ سے معاملت کرنے کے لئے ان کے پاس آئی،

"ص ع"

بابُ التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر

علی گڈھ میگزین کا اقبال نمبر، مرتبہ محمد ابو اللیث صاحب صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۱۸۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- مسلم یونیورسٹی علیگڈھ،

گذشتہ ۹ جنوری کو شاعر اسلام سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے اظہار عقیدت کے لئے سارے ہندوستان میں بڑے جوش و اخلاص کے ساتھ "یوم اقبال" منایا گیا، مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے اس کی یادگار میں علیگڈھ میگزین کا یہ خاص نمبر نکالا ہے، لیکن کسے خبر تھی کہ چند ہی مہینوں کے بعد یہ نغمہائے طرب صدائے شیون بن جائیں گے، چنانچہ یہ نمبر اس وقت نکلا جب اقبال اپنی شاعری کی سوغات لیکر اپنے رب کے حضور میں پہونچ چکا تھا، اس لئے اس گلدستہ عقیدت کے ساتھ اشک حسرت بھی شامل ہیں، اس نمبر میں اقبال کی شاعری، ان کی تعلیمات و پیامات پر طلبہ اور اساتذہ کے متعدد اچھے مضامین ہیں، ان میں "اقبال" غلام سرور صاحب ایم اے، "اقبال کے کلام میں عشق کا تخیل" ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے، "اقبال اور عشق رسول" شیخ عطاء اللہ صاحب ایم اے "اقبال اور اردو غزل"، قمر الدین خان صاحب متعلم ایم اے، خاص طور سے لائق ذکر ہیں، مسلم یونیورسٹی اور طلبہ کی مناسبت سے محمد رضا علی خانصاحب ایڈوکیٹ جبلپور کی تقریر بھی مفید ہے، نثر کے مضامین کے علاوہ اقبال سے متعلق متعدد اچھی نظمیں ہیں، تبرکاً ان کے ایک خط کا فوٹو اور ان کی متعدد تصویریں بھی ہیں، لیکن

علامہ مرحوم کی وفات کے بعد "قوم اور وطن" کے سلسلہ کی اخلاقی نظموں کو شائع کرنا کچھ مناسب نہ تھا، اور یہ فرمے آسانی کیساتھ نکالے جا سکتے تھے،

سب رس اقبال نمبر، مرتبہ میر محمد علی خانصاحب میکش، تقطیع بڑی ضخامت ۱۶۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ رفعت منزل خیرت آباد، حیدر آباد دکن،

سب رس نے سر اقبال مرحوم کی وفات پر اظہار غم کے لئے یہ خاص نمبر نکالا ہے، سب رس کا بنیادی مقصد ہر معیار اور ہر استعداد کے مضامین پیش کرنا ہے، اس لئے اس نمبر میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اس میں اقبال کی شاعری پر مبسوط ناقدانہ مضامین کے بجائے اس کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، ان کے لکھنے والوں میں حیدر آباد کے مشہور اہل قلم بھی ہیں اور نوآموز بھی اس تنوع سے اختصار کیساتھ اقبال کی شاعری کے بہت سے اہم پہلوؤں کا تعارف ہو گیا ہے، رضی الدین صاحب کا مضمون "اقبال کا پیام حیات" ان کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے، اس نمبر کی یہ خصوصیت لائق ذکر ہے کہ اس میں متعدد خواتین اور ہندو حضرات کے مضامین بھی ہیں، ان میں لطیف النساء بیگم کا مضمون "اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر" اور مہندر راج صاحب سکسینہ کا مضمون "شاعر حکمت شناس" اچھے ہیں، مضامین کے علاوہ حیدر آباد میں "یوم اقبال" اور یہاں کے تعزیتی جلسوں کی مختصر روئدادیں اور مشاہیر ہند کے پیامات بھی درج کر دیئے گئے ہیں، جن سے اس حادثہ کے حالات اور ہندوستان میں اس کے تاثرات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے "اقبال اور حیدر آباد دکن" کے عنوان سے حیدر آباد سے متعلق اقبال کی نظمیں بھی دیدی گئی ہیں۔

زمانہ پریم چند نمبر، مرتبہ منشی دیا نراین صاحب نگم بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ؍ پتہ دفتر زمانہ کانپور،

منشی پریم چند کی ادبی خدمات کے احسان سے ہماری زبان گرانبار ہے، ان کی موت پر

اردو دنیا نے مختلف طریقوں سے ان کے خدمات کا اعتراف کیا ہے، اس سلسلہ میں اردو زبان کے پرانے خادم منشی دیا نراین صاحب اڈیٹر زمانہ نے جن کے منشی پریم چند کے ساتھ علمی و ادبی تعلقات کے علاوہ ذاتی روابط بھی تھے، زمانہ کا یہ خاص نمبر نکالا ہے، منشی پریم چند بڑے کثیر الاحباب تھے، اس نمبر میں ان کے دوستوں، جاننے والوں اور بہت سے مشاہیر اہل قلم نے ان کے ذاتی حالات اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے، مضمون نگاروں میں مولینا عبد الماجد صاحب دریابادی، مرزا محمد عسکری، مرزا فدا علی خنجر لکھنوی، فراق گورکھپوری اور خود اڈیٹر صاحب زمانہ کے نام خاص طور سے لائق ذکر ہیں، یہ نمبر تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں منشی جی کی سیرت و سوانح پر مضامین ہیں، اس حصہ میں اڈیٹر صاحب زمانہ کا مضمون منشی پریم چند کے حالات زندگی پر بجائے خود ایک مبسوط تبصرہ ہے، منشی جی کے مختصر خود نوشت حالات خاص چیز ہے، دوسرے حصہ میں ان کے ادبی خدمات کا تذکرہ اور ان کے مختلف پہلوؤں پر نقد و تبصرہ ہے، تیسرے حصہ میں وہ نظمیں ہیں جو ان کی وفات پر لکھی گئیں، منشی جی کی زندگی کے حالات اور ان کے ادبی خدمات اس طرح لازم و ملزوم ہیں، کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے دکھانا مشکل ہے، اسلئے سیرت کے حصہ کے بعض مضامین میں بھی ادبی خدمات کا ضمناً تذکرہ آگیا ہے، مضامین کے علاوہ منشی جی کی چند تصویریں اور ان کے خطوط کے فوٹو ہیں، یہ نمبر منشی پریم چند کے حالات اور ان کے علمی و ادبی خدمات اور اس پر نقد و نظر کا اچھا مجموعہ ہے،

پیغام حق اشاعت خاص، مرتبہ سید محمد شاہ صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں پتہ:- دار السلام جمالپور تحصیل پٹھانکوٹ، ضلع گرداسپور، پنجاب،

موجودہ سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کی شرکت اور آیندہ طریق عمل کے متعلق مولانا سید ابو الاعلیٰ

مودودی نے "ترجمان القرآن" میں ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا، جو کافی شہرت حاصل کر چکا ہے، سید محمد شاہ صاحب نے "پیغام حق" کی ایک خاص اشاعت میں ان تمام مضامین کو جمع کر دیا ہے، ان مضامین میں ابوالاعلیٰ صاحب نے اپنے خاص نقطۂ نظر کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کے گذشتہ سیاسی و مذہبی حالات، موجودہ حیثیت و طرزِ عمل اس کے نتائج اور ان کی مذہبی روایات اور تمدنی خصوصیات وغیرہ پر بحث کر کے دکھایا ہے، کہ مسلمانوں کو موجودہ مشترکہ سیاسی جد و جہد سے الگ ہو کر ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے خالص مذہبی بنیادوں پر اپنی تعمیر کرنی چاہئے،

ساقی افسانہ نمبر، مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۷۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:۔ دفتر ساقی دہلی،

افسانوں کے انتخاب میں حسنِ ذوق اور زبان کی صحت و صفائی کے لحاظ سے رسالہ ساقی کو ادبی رسائل میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے، اس کا یہ افسانہ نمبر بھی ان خصوصیات کا حامل ہے، بیشتر افسانے اور ڈرامے نتیجہ خیز، ستھرے اور پڑھنے کے لائق ہیں، اس ضخیم نمبر میں بہت کم افسانے بے مقصد اور غیر دلچسپ نظر آئے، مختصر اور چھوٹے افسانے بھی لطف سے خالی نہیں ہیں، حسب معمول مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے شکسپیر کے ایک "ڈرامے" کا ترجمہ "تائمن ایتھنزی کے حالات زندگی" بھی شامل ہے،

ادبِ لطیف افسانہ نمبر، مرتبہ چودھری برکت علی صاحب و مرزا ادیب بی اے، تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ار، پتہ مکتبہ اردو لاہور

حسب معمول امسال بھی ادبِ لطیف نے ہر ذوق کے دلچسپ افسانوں کا یہ ضخیم نمبر نکالا ہے، ان میں "صحرانورد کے خطوط" اور "پریم کا سپنا" خصوصیت کیساتھ زیادہ دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، افسانوں کے علاوہ فن افسانہ نگاری پر متعدد مفید مضامین ہیں، منظوم افسانوں کے نام سے

چند اچھی نظمیں ہیں، اس قسم کی نظمیں ہر رسالہ میں نکلتی رہتی ہیں، ادبِ لطیف نے ان کو "منظوم افسانے" کا نام دیدیا ہے، خیال آتا ہے کہ بلبنیکا کا ترجمہ ابن سراج کے نام سے عرصہ ہوا مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی شائع کر چکے ہیں، لیکن اسوقت وہ ہمارے سامنے نہیں ہے، اسلئے یقین کیساتھ نہیں کہ سکتے، اگر ایسا ہے تو توارد ممکن ہے،

رفیق الطلبہ مرتبہ جناب شیخ قطب الدین عبداللہ صاحب (حصہ اردو) و صغیر خان قاسم خان صاحب (حصہ انگریزی) تقطیع بڑی ضخامت ہر دو حصہ ۱۴۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت خاص نمبر عہ، پتہ:۔ اینگلو اردو ہائی پونہ،

پونہ میں اینگلو اردو ہائی اسکول مسلمانوں کا بہت پرانا اسکول ہے اور وہاں اردو زبان کی نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دے رہا ہے، کئی سال سے اس اسکول کے طلبہ کا ایک رسالہ رفیق الطلبہ اردو زبان میں نکلتا ہے، حال میں اس اسکول کی نئی عمارت تعمیر ہوئی ہے، اس کے افتتاح کی تقریب میں رفیق الطلبہ کا خاص نمبر نکلا ہے، اس نمبر میں اسکول کی مختصر تاریخ، تقریب افتتاح کی تقریریں اور چند ادبی مضامین اور اسکول کی عمارتوں اور بعض مسلمان عمائد کے فوٹو ہیں، طلبہ کی استعداد اور نو کو دیکھتے ہوئے جہاں اردو کی رقیب مقامی مرہٹی زبان موجود ہے، یہ رسالہ قابلِ تعریف ہے، ہمکو امید ہے، کہ رفیق الطلبہ وہاں کے نوجوانوں میں اردو زبان کا مذاق پیدا کرے گا،

نئے رسالے

خالد مرتبہ مولانا سید احمد صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ عہ، پتہ دفتر خالد دیوبند ضلع سہارنپور،

یہ رسالہ چند مہینوں سے مولینا محمد اعزاز علی صاحب کی نگرانی اور مولانا سید احمد صاحب کی ادارت میں نکل رہا ہے، اس کا مقصد ایسے علمی مذہبی اور ادبی مضامین پیش کرنا ہے جس سے

عام مسلمان بھی فائدہ اٹھا سکیں اس مقصد میں یہ رسالہ کامیاب ہے، وقتاً فوقتاً حضرات اکابر دیوبند کے علمی و مذہبی افادات بھی پیش کرتا ہے، مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی و مولینا اعزاز علی صاحب کے افادات میں "قرآن مجید میں تکرار کیوں ہے" اور "افضل الجہاد" لائق ذکر ہیں، مولینا عاشق الٰہی کے قلم سے تاریخ اسلام کا مسلسل مضمون نکل رہا ہے "حضرت خالدبن ولید اور مالک بن نویرہ" کے واقعہ پر معارف میں تفصیلی بحث نکل چکی ہے، بعض پرانے منقولات بلا حوالہ نظر آتے ہیں، مثلاً انسانیت موت کے دروازہ پر کا پورا سلسلہ الہلال کے دوسرے دور میں نکل چکا ہے، عام مسلمانوں کے مذہبی معلومات کے لئے یہ رسالہ مفید ہے،

طرحِ نو مرتبہ جناب سراج الدین صاحب ظفر بی اے، تقطیع بڑی ضخامت ۶۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ ؎ پتہ اردو بک اسٹال بیرون دروازہ لاہور،

ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کیساتھ ہمارے نوجوانوں میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے اس کا اثر دن بدن ہمارے لٹریچر میں نمایاں ہوتا جاتا ہے، آج نوجوانوں میں ایسے لٹریچر کی مانگ اور مقبولیت ہے، جو ہندوستانیوں میں ذہنی انقلاب پیدا کرے، "طرح نو" اس لٹریچر کا مبلغ ہے، اس کے تمام مضامین اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، وہ دنیا کے ایسے سیاسی حالات انقلابات اور جدید رجحانات کو پیش کرتا ہے، جو ہندوستانیون کی ذہنیت بدلنے میں معاون ہون، مثلاً نیا ادب اور ہماری ذمہ داریان "ہندوستان کے کسانون کی ہڑتال" "غلاموں کی بغاوت" "عورت کی معاشی غلامی" "روس کی طرح نو" "نازی ازم" "چند غیر ملکی تحریکات" وغیرہ اس کے ادب افسانے اور منظومات سب اسی مقصد کے ماتحت ہوتے ہیں، لیکن یہ بڑا دشوار گذار مرحلہ ہے، اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، کہ بے قید ذہنی انقلاب معلوم نہیں نوجوانوں کو کہاں سے کہاں بہالیجائے گا،

صوت المدرسہ تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ اچھا، ٹائپ روشن، قیمت مرقوم

نہیں، پتہ: مدرسہ عالیہ کلکتہ،

مشرقی ہندوستان میں عربی کی سب سے قدیم درس گاہ مدرسہ عالیہ کلکتہ ہے، اسکو قائم ہوئے ڈیڑھ صدی سے اوپر ہوگئے، لیکن اب تک اس کا کوئی ترجمان رسالہ نہ تھا، طلبہ اور کارکنان مدرسہ نے اس ضرورت کو محسوس کرکے صوت المدرسہ کے نام سے یہ ششماہی رسالہ جاری کیا ہے، مدرسہ عالیہ مختلف حیثیتوں سے متعدد زبانوں کا مخزن ہے، عربی تعلیم کی زبان ہے اردو ملکی، بنگلہ صوبائی انگریزی اور فارسی بطور ثانوی زبان کے پڑھائی جاتی ہیں، اس لئے صوت المدرسہ میں ان تمام زبانوں کے علحدہ علحدہ حصے ہیں، اور ان سب کے الگ الگ اڈیٹر، اڈیٹروں کی فہرست میں فارسی اڈیٹر کا نام تو ہے لیکن فارسی کا کوئی مضمون نظر نہیں آیا، ابھی اس رسالہ کا پہلا نمبر نکلا ہے، طلبہ کی استعداد کو دیکھتے ہوئے، ہر زبان کے مضامین خاصے ہیں، خصوصاً عربی کے مضامین اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں، کہ عربی مدارس میں عربی انشاء کا ذوق تقریباً مفقود ہے، بنگلہ سے ہم ناواقف ہیں، اسلئے اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دیسکتے، طلبہ کے علاوہ بعض اساتذہ کے مضامین بھی ہیں امید ہے کہ یہ رسالہ مدرسہ عالیہ کے طلبہ میں عربی اور اردو مضمون نگاری کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہوگا

عربک کالج میگزین، مرتبہ جناب عزیز اللہ صاحب فاروقی خیری، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ بہتر، ٹائپ اچھا، قیمت مرقوم نہیں، پتہ: عربک کالج دہلی،

شمالی ہند میں مدرسہ عالیہ کا چھوٹا بھائی دلی کا عربک کالج ہے، اسکو قائم ہوئے بھی ایک صدی سے اوپر ہو چکی، اس کا ترجمان عربک کالج میگزین اردو انگریزی میں عرصہ سے نکلتا ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کے لئے ایک نمبر آیا ہے، علمی ادبی تاریخی مختلف رنگ کے اوسط درجے کے مضامین ہیں، "شیطان کے بچے" دلچسپ ڈرامہ ہے، لیکن عربک کالج دہلی کے لحاظ سے ابھی اس کا معیار اور بلند کرنے کی ضرورت ہے،

بنات، مرتبہ جناب رازق الخیری صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی، قیمت سالانہ عہ، پتہ:۔ دفتر بنات کوچہ چیلان، دہلی،

مولینا راشد الخیری مرحوم نے مدرستہ البنات کے ساتھ مسلمان بچیوں کے لئے ایک رسالہ بنات جاری کیا تھا، یہ رسالہ گیارہ سال سے جاری ہے، اور مولانا مرحوم کے فرزند رازق الخیری صاحب اس کو کامیابی سے چلا رہے ہیں، یہ رسالہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے عصمت کا مثنی ہے لیکن بچیوں کی استعداد کے لحاظ سے معیار اس سے کم رکھا گیا ہے اس میں مختلف قسم کے معلومات بڑھانے والے چھوٹے چھوٹے مضامین، دلچسپ اور سبق آموز قصے، ستھری نظمیں، سلیقہ اور ہنر سکھانے والی باتیں، غرض ایک شریف مسلمان لڑکی کی تعلیم و تربیت کیلئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، سب اسمیں موجود ہیں، یہ رسالہ چھوٹی بچیوں، نوجوان لڑکیوں اور شادی شدہ خواتین سب کے لئے یکساں مفید ہے،

نارجیلستان، مرتبہ مولوی ہارون صاحب ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ سالانہ، پتہ:۔ تلچری، مالابار،

مالابار میں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے، لیکن یہ خطہ ہندوستان سے ایسا الگ تھلگ ہے کہ وہان کے مسلمانوں اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں صرف نام کا تعلق تھا، سرفروش موپلون کی قربانی کے زمانہ سے ان سے عام مسلمانوں سے تعلق پیدا ہوا، ان کا تمدن، اور ان کی زبان بھی بالکل جداگانہ ہے، مقامی زبان "ملایالم" ہے لیکن کچھ دکن کے مسلمانوں کے اثر اور کچھ اردو زبان کی عالمگیر مقبولیت نے اس کا قدم اس دور دراز خطہ میں پہونچا دیا ہے، اور اب یہاں کے مسلمانوں میں اردو کا ذوق بڑھتا جاتا ہے، جس کا ثبوت یہ رسالہ ہے، جسے حال میں ایک ندوہ کے فارغ التحصیل نے نکالا ہے، ہم نے اس کا صرف ایک نمبر دیکھا ہے، اسے دیکھ خوشی اور تعجب دونوں ہوا کہ ایسے دور دراز مقام سے جس کو اردو سے کوئی تعلق نہیں، ایسا اچھا رسالہ نکل سکتا ہے، یہ رسالہ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں کے

لحاظ سے تعریف کے لائق ہے، مضمون نگاروں میں متعدد شمالی ہند کے ارباب قلم کے نام ہیں، مضامین سب سنجیدہ اور مفید ہیں، لیکن ہم کو یہ خطرہ ہے کہ یہ پودا ناموافق آب و ہوا میں کہیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی خشک نہ ہو جائے، اسلئے دکن کے مسلمانوں کو خصوصاً اسکی قدر افزائی کرنی چاہئے کہ آگے چل کر یہ رسالہ مالابار میں اردو کا نقیب ثابت ہو،

شمس المشائخ، مرتبہ مقبول احمد صاحب داوری تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ وکتابت وطباعت معمولی قیمت ۶ر، پتہ: شریف گنج، امرتسر،

یہ رسالہ پنجاب کے ایک بزرگ سید بابا شاہ سوار قادری کی یادگار میں حال میں نکلا ہے، اسلامی موضوعوں پر معمولی درجہ کے مختصر مضامین ہوتے ہیں،

حشر، مرتبہ ویدپرکاش صاحب سرور کھتوریہ تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ وکتابت معمولی، قیمت سالانہ ۶ر فی پرچہ ۲ر، پتہ کوٹ کشن چند، جالندھر،

یہ رسالہ آغا حشر کاشمیری مرحوم کی یادگار میں جالندھر سے نکلتا ہے، اسکے انتساب سے ظاہر ہی کہ رسالہ فلمی اور ادبی ہے، کبھی کبھی معمولی درجہ کے علمی اور تاریخی مضمون بھی نظر آجاتے ہیں،

اخبارات

زمزم مرتبہ جناب نصر اللہ خان صاحب عزیز تقطیع بڑی ضخامت ۱۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ سے ششماہی ہیر، پتہ دفتر زمزم بیرون موری دروازہ لاہور،

یہ نیا سہ روزہ اخبار حال میں جناب نصر اللہ خان صاحب عزیز کی ادارت میں لاہور سے نکلا ہے، نصر اللہ خان صاحب جیسے تجربہ کار اخبار نویس کی ادارت اخبار کی خوبی اور کامیابی کی کافی ضمانت ہے اخبار نویسون کی جماعت میں وہ پرانے قوم پرور ہیں، یہی مسلک اس اخبار کا ہے، ابھی اس کو نکلے چند ہی ہفتے ہوئے ہیں، لیکن وہ کسی حیثیت سے پرانے اور اچھے سہ روزہ اخبارات سے کم نہیں ہے،

جو اس کی کامیابی کا پہلا زینہ ہے، اخباری معیار سے معلومات وافر، خبریں متنوع، مسلک صحیح، رائیں سنجیدہ، غرض ایک بلند پایہ اخبار کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے، سب اس میں موجود ہیں، اس طوائف الاخباری کے دور میں کسی اچھے سنجیدہ اور صائب الرائے اخبار کا نکلنا نہایت مفید ہے، امید ہے اس ہنگامہ آرائی کے دور میں زمزم مذاق عوام سے اپنا دامن بچاتے ہوئے ملک وملت کی سچی خدمت انجام دیگا، اور مسلمان بھی اس مخلص خادم کی پوری قدردانی کریں گے،

ہندوستان (ہفتہ وار) مرتبہ مولوی حیات اللہ صاحب انصاری تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ار پتہ نمبر ۶ نیل روڈ لکھنؤ،

یہ اخبار "ہندوستان نیوز پیپرس کمپنی" کی جانب سے عرصہ سے کانگریس کے پروپگنڈے کیلئے نکل رہا ہے، اس کا شعبۂ ادارت متعدد تعلیم یافتہ اشخاص کے ہاتھوں میں ہے، مالی حیثیت سے بھی اسں کو فراغت حاصل ہے، اسلئے ظاہری اور بعض معنوی خوبیوں کے لحاظ سے وہ سیاسی اخباروں کے لئے نمونہ ہے، سیاسی خبروں کے ساتھ ہندوستان اور بیرونی دنیا کے اہم سیاسی حالات وکوائف پر ناقدانہ تبصرہ ہوتا ہے، مختلف سیاسی اور معاشی مسائل پر پرمغز مقالات ہوتے ہیں، عام دلچسپی کے لئے ادب وافسانے کی چاشنی بھی ہوتی ہے، لیکن سب سیاسی بلکہ انقلابی رنگ لئے ہوئے، ہندوستان چونکہ کانگریس کا آرگن ہے، اور اس کی باگ نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے، اس لئے انقلابی نوجوانوں کی طرح اس کے مسلک میں بھی بے اعتدالی اور انتہا پسندی پائی جاتی ہے، اختلافی مسائل میں مخالف جماعتوں کے ساتھ ناگوار حد تک لہجہ میں تلخی اور کبھی کبھی ابتذال آجاتا ہے، جو ایک کانگریسی اخبار کے لئے موزوں نہیں ہے،

"م"

مطبوعات جدیدہ

اسلامی ہند پر ایک نظر (حصہ اول) مصنفہ جناب محمد شعیب خان صاحب فیروز، تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ قصبہ برلہ ضلع علیگڈھ،

ہندوستان میں سیاسی شعور کے آغاز سے مسلمانوں کو سیاست کا جو غلط سبق پڑھایا گیا تھا، اور جس غلط راستہ سے وہ اس راہ پر لائے گئے تھے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ آج تک ان کا قدم صحیح جادہ پر نہ پڑسکا، اور وہ خارجی سیاست میں اُلجھے رہے، ہنگامی حوادث کے وقت وہ صحیح راستہ کی طرف بڑھے ضرور، لیکن چونکہ ان کا سیاسی مزاج پختہ نہ ہوا تھا، اس لئے حالات کے بدلتے ہی پھر پلٹ گئے، ہندوستان کے سیاسی تغیرات کے ساتھ صاحب فکر مسلمانوں میں انکی اس سیاسی پریشان نظری اور بے راہ روی اور اس کے تدارک کا احساس بڑھتا جاتا ہے، مذکورۂ بالا کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے، اس میں مسلمانوں کی گذشتہ اور موجودہ سیاسی بے راہ روی اور اُن کے غیر مآل اندیشانہ طرز عمل اور اس کے نتائج کو دکھا کر ان کے لئے صحیح راہِ عمل متعیّن کی گئی ہے، اور وطنیت اور قومیت کے مفہوم، ہندوستان کیساتھ مسلمانوں کے تعلق اور اس پر ان کے حقوق وفرائض پر قومی اور مذہبی نوعیتوں پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے، اور اس کے خلاف جو دلیلیں پیش کیجاتی ہیں، ان پر تنقید کرکے ہندوستان سے متعلق مسلمانوں کا صحیح فرض بتایا گیا ہے، اس سلسلہ میں ضمناً مسلمانوں کی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر نہایت مفید بحثیں ہیں، اس قسم کی کتابوں میں عموماً مسلمانوں کی پستی اور زبون حالی کا رونا رویا جاتا ہے، جس سے ان میں اپنی حالت سے اور مایوسی اور بددلی پیدا ہوتی ہے، لیکن اس

کتاب میں ان کی عظمت و شان ظاہر کرکے انھیں دلولوں سے معمور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس قسم کے مشوروں سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا، کہ ان سے اسلامی اخوت کا رشتہ ٹوٹتا ہے، اس لئے کہ بڑی حد تک خود اسلامی ممالک کی آزادی اور ان کا امن و سکون ہندوستان کی آزادی سے وابستہ ہے، اس سے کون واقف کار انکار کرسکتا ہے، کہ اسلامی ممالک کے جو حصے جس حد تک بھی برطانوی سیاست کے دام میں ہیں، وہ صرف ہندوستان پر گرفت مضبوط رکھنے کے لئے، یہ صرف ہندوستان کی غلامی کا نتیجہ تھا، کہ جنگ عظیم میں ٹرکی، عراق، شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کے فرزندوں کے سینوں پر ہندوستان کی فوجوں، بلکہ مسلمان پلٹنوں نے سنگینیں چلائیں، کیا یہی اسلامی اخوت ہے، کہ ایک طرف زبانی اس کا دعوی کیا جائے، دوسری طرف ہندوستانی مسلمان ان کے سینوں پر گولیاں بجائیں، اور ان کے ملکوں کو غلام بنانے کا وسیلہ بنیں، ایسی حالت میں جبکہ ہم غلامی کی حالت میں دنیائے اسلام کیساتھ کوئی عملی ہمدردی نہیں کرسکتے، خالص ہندوستان کی آزادی پر توجہ کا مشورہ قطعاً اخوت اسلامی کے خلاف نہیں ہے، بہرحال یہ کتاب مسلمانوں کے موجودہ سیاسی انتشار کے دور میں نہایت مفید ہے، اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کو اسکا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے، جناب مصنف سے درخواست ہے، کہ وہ جلد سے جلد اسکی دوسری جلد کی اشاعت کا انتظام فرمائیں،

قادیانی قول و فعل، مؤلفہ جناب صلاح الدین محمد الیاس برنی صاحب ایم اے،
تقطیع چھوٹی ۳۹۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ کمال احمد صاحب فاروقی بیت السلام حیدرآباد، دکن،

مولوی الیاس برنی صاحب ناظم دار الترجمہ کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" سے ناظرین معارف اچھی طرح واقف ہوں گے، اس کتاب نے قادیانی جماعت میں بڑی ہلچل ڈالدی، انھوں نے اس کے جواب میں "بشارت احمد" لکھی، ہم نے یہ کتاب نہیں دیکھی، لیکن قادیانی قول و فعل کی تنقیح سے معلوم

ہوتا ہے، کہ یہ جوابات ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

کا مصداق ہیں، اور اس میں حسب معمول غلط تاویلات سے مسلمانوں کو قادیانی مذہب کی جانب سے مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، برنی صاحب نے ان جوابات کی تنقیح میں یہ کتاب تالیف فرمائی ہے، اگرچہ یہ کتاب جواب الجواب کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے، لیکن مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے اس کی حیثیت مستقل تالیف کی ہے، برنی صاحب چونکہ اخلاص و حسن نیت سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں، اس لئے توفیق الہی ان کے سامنے انسداد قادیانیت کے نئے نئے دروازے کھولتی جاتی ہے، چنانچہ "قادیانی قول و فعل" میں "بشارت احمد" کے جوابات کے جائزہ کیساتھ قادیانی مذہب کے بعض ایسے رخوں کو جو مخفی تو نہیں تھے، لیکن پس چلمن ضرور تھے، بے نقاب کیا ہے، اور "قادیانی مذہب" کی طرح خود مرزا صاحب، ان کے خلفاء اور قادیانی مذہب کے اکابر کی تحریروں اور تقریروں سے دکھایا ہے، کہ "قادیانی تحریک" کی حقیقت، اس کا منشاء و مقصد اور اس کے نتائج کیا ہیں، اس کے پڑھنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے، کہ قادیانیت اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک مستقل تحریک، اور ہندوستانی قومی تحریکوں کے خلاف ایک منظم اور مخفی سازش ہے، اس کتاب میں بھی برنی صاحب نے ضروری تشریحوں کے علاوہ خود بہت کم لکھا ہے، اور جہاں لکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے، مثلاً مرزا صاحب کے مرض الموت کے اسباب کی تحقیق کے سلسلہ میں ان کے قلم کی "تراوش" قابل دید ہے، بعض بعض مقامات پر تو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا، اگرچہ کتاب مناظرانہ ہے، لیکن مصنف کی شگفتہ نگاری نے اس کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے، مصنف کی پہلی تصنیف "قادیانی مذہب" کی طرح مسلمانوں کو "قادیانی قول و فعل" کا بھی مطالعہ کرنا ضروری ہے،

طب قدیم و جدید، مصنفہ جناب حکیم محمد اسمٰعیل صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۸ صفحے،
کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت: ۱۲ر پتہ: معتمد کتب خانہ سعیدیہ جام باغ ترپ بازار حیدرآباد دکن

اعلیٰ حضرت نظام دکن کے جشن سیمیں کی تقریب کے موقع پر انجمن طبیہ حیدرآباد نے طب یونانی اور ڈاکٹری کے موازنہ اور ممالک محروسۂ سرکار عالی میں اس کی ترقی کی تدابیر پر انعامی مضامین لکھائے تھے، ان میں مدرسہ طبیہ حیدرآباد کے ایک فرزند حکیم محمد اسمٰعیل صاحب کا مضمون اول قرار پایا، جس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس کتاب کے آغاز میں مختلف قوموں خصوصاً یونانی اور اسلامی طب کی تاریخ اور اس سے یورپ کے استفادہ کے مختصر حالات ہیں، اس کے بعد مستند ماخذوں سے دکھایا گیا ہے کہ یونانی طب فن طب کی اکثر شاخوں میں ڈاکٹری سے پیچھے نہیں ہے، اور وہ بہت سی تحقیقاتیں جو ڈاکٹری کا کارنامہ سمجھی جاتی ہیں، بجنسہا یا نام اور شکل کی تبدیلی کے ساتھ طب یونانی میں موجود ہیں، اور ان سے ڈاکٹری نے استفادہ کیا ہے، معالجہ میں بھی وہ ڈاکٹری سے کم کامیاب نہیں ہے، بلکہ دواؤں کی ارزانی وسہولت اور ہندوستانی طبائع سے ان کی مناسبت اور بے ضرر ہونے کے لحاظ سے وہ ڈاکٹری سے زیادہ مرجح اور کامیاب ہے، آخر میں دور عثمانی کی طبی ترقیوں کو دکھایا گیا ہے، اور آئندہ مزید ترقی کی تدبیروں کو پیش کیا گیا ہے، طب یونانی کی حمایت میں علمی حیثیت سے بہت اچھی کتاب ہے، لیکن اسے موازنہ کہنا صحیح نہیں ہے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ طب یونانی کی پستی وجمود اور اس کے غیر علمی ہونے کے بارہ میں جو غلط فہمی اور ڈاکٹری کے ساتھ جو غیر معتدل حسن عقیدت ہے، اس کی محققانہ تردید کر کے دونوں کا صحیح درجہ واضح کیا گیا ہے، اور اس حیثیت سے یہ کتاب لائق قدر ہے، تعجب ہے کہ اس کے حوالوں میں عیون الانباء فی طبقات الاطبا، کا نام کہیں نہیں نظر آتا،

"م"